دقیق شبہات ٹھوس جوابات
جلد اول
آیۃ اللہ مصباح یزدی
الناشر : مجمع جہانی اہل بیت (علیہم السلام)

نام کتاب: دقیق شبہات ٹھوس جوابات (جلد اوّل)

مؤلف: آیۃ اللہ مصباح یزدی

تدوین: محمد مہدی نادری قمّی

مترجم: سید عترت حسین رضوی

مصحح: مرغوب عالم

نظر ثانی: ہادی حسن فیضی

پیشکش: معاونت فرہنگی، ادارۂ ترجمہ

کمپوز و گرافک: رضا عباس خان

ناشر: مجمع جہانی اہل بیت (ع)

حرف اول

جب آفتاب عالم تاب افق پر نمودار ہوتا ہے کائنات کی ہر چیز اپنی صلاحیت وظرفیت کے مطابق اس سے فیضیاب ہوتی ہے حتی ننھے ننھے پودے اس کی کرنوں سے سبزی حاصل کرتے اور غنچہ وکلیاں رنگ ونکھار پیدا کرلیتی ہیں تاریکیاں کافور اور کوچہ وراہ اجالوں سے پرنور ہوجاتے ہیں، چنانچہ متمدن دنیا سے دور عرب کی سنگلاخ وادیوں میں قدرت کی فیاضیوں سے جس وقت اسلام کا سورج طلوع ہوا، دنیا کی ہر فرد اور ہر قوم نے قوت وقابلیت کے اعتبار سے فیض اٹھایا۔

اسلام کے مبلغ وموسس سرور کائنات حضرت محمد مصطفی غار حراء سے مشعل حق لے کر آئے اور علم وآگہی کی پیاسی اس دنیا کو چشمۂ حق وحقیقت سے سیراب کردیا، آپ کے تمام الٰہی پیغامات ایک ایک عقیدہ اور ایک ایک عمل فطرت انسانی سے ہم آہنگ ارتقائے بشریت کی ضرورت تھا، اس لئے ۲۳ برس کے مختصر عرصے میں ہی اسلام کی عالمتاب شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں اور اس وقت دنیا پر حکمراں ایران وروم کی قدیم تہذیبیں اسلامی قدروں کے سامنے ماند پڑگئیں، وہ تہذیبی اصنام جو صرف دیکھنے میں اچھے لگتے ہیں اگر حرکت وعمل سے عاری ہوں اور انسانیت کو سمت دینے کا حوصلہ، ولولہ اور شعور نہ رکھتے تو مذہبِ عقل وآگہی سے روبرو ہونے کی توانائی کھودیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ کہ ایک چوتھائی صدی سے بھی کم مدت میں

اسلام نے تمام ادیان و مذاہب اور تہذیب و روایات پر غلبہ حاصل کر لیا۔

اگرچہ رسول اسلام کی یہ گرانبہا میراث کہ جس کی اہل بیت علیہم السلام اور ان کے پیرووں نے خود کو طوفانی خطرات سے گزار کر حفاظت و پاسبانی کی ہے، وقت کے ہاتھوں خود فرزندان اسلام کی بے توجہی اور نا قدری کے سبب ایک طویل عرصے کے لئے تنگنائیوں کا شکار ہو کر اپنی عمومی افادیت کو عام کرنے سے محروم کر دی گئی تھی، پھر بھی حکومت و سیاست کے عتاب کی پروا کئے بغیر مکتب اہل بیت علیہم السلام نے اپنا چشمۂ فیض جاری رکھا اور چودہ سو سال کے عرصے میں بہت سے ایسے جلیل القدر علماء و دانشور دنیائے اسلام کو تقدیم کئے جنھوں نے بیرونی افکار و نظریات سے متاثر اسلام و قرآن مخالف فکری و نظری موجوں کی زد پر اپنی حق آگین تحریروں اور تقریروں سے مکتب اسلام کی پشتپناہی کی ہے اور ہر دور اور ہر زمانے میں ہر قسم کے شکوک و شبہات کا ازالہ کیا ہے، خاص طور پر عصر حاضر میں اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد ساری دنیا کی نگاہیں ایک بار پھر اسلام و قرآن اور مکتب اہل بیت علیہم السلام کی طرف اٹھی اور گڑی ہوئی ہیں، دشمنان اسلام اس فکری و معنوی قوت و اقتدار کو توڑنے کے لئے اور دوستداران اسلام اس مذہبی اور ثقافتی موج کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑنے اور کامیاب و کامراں زندگی حاصل کرنے کے لئے بے چین و بے تاب ہیں، یہ زمانہ علمی اور فکری مقابلے کا زمانہ ہے اور جو مکتب بھی تبلیغ اور نشر و اشاعت کے بہتر طریقوں سے فائدہ اٹھا کر انسانی عقل و شعور کو جذب کرنے والے افکار و نظریات دنیا تک پہنچائے گا، وہ اس میدان میں آگے نکل جائے گا۔

(عالمی اہل بیت کونسل) مجمع جہانی اہل بیت علیہم السلام نے بھی مسلمانوں خاص طور پر اہل بیت عصمت وطہارت کے پیرووں کے درمیان ہم فکری و یکجہتی کو فروغ دینا وقت کی ایک اہم ضرورت قرار دیتے ہوئے اس راہ میں قدم اٹھایا ہے کہ اس نورانی تحریک میں حصہ لے کر بہتر انداز سے اپنا فریضہ ادا کرے، تاکہ موجودہ دنیائے بشریت جو قرآن و عترت کے صاف وشفاف معارف کی پیاسی ہے زیادہ سے زیادہ عشق و معنویت سے سرشار اسلام کے اس مکتب عرفان وولایت سے سیراب ہوسکے، ہمیں یقین ہے عقل وخرد پر استوار ماہرانہ انداز میں اگر اہل بیت عصمت وطہارت کی ثقافت کو عام کیا جائے اور حریت و بیداری کے علمبردار خاندان نبوت ﷺ ورسالت کی جاوداں میراث اپنے صحیح خدوخال میں دنیا تک پہنچادی جائے تو اخلاق وانسانیت کے دشمن، انانیت کے شکار، سامراجی خوں خواروں کی نام نہاد تہذیب و ثقافت اور عصر حاضر کی ترقی یافتہ جہالت سے تھکی ماندی آدمیت کو امن ونجات کی دعوتوں کے ذریعہ امام عصر (عج) کی عالمی حکومت کے استقبال کے لئے تیار کیا جاسکتا ہے۔

ہم اس راہ میں تمام علمی و تحقیقی کوششوں کے لئے محققین و مصنفین کے شکر گزار ہیں اور خود کو مؤلفین ومترجمین کا ادنیٰ خدمتگار تصور کرتے ہیں، زیر نظر کتاب، مکتب اہل بیت کی ترویج و اشاعت کے اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، فاضل علام آیۃ اللہ جناب محمد تقی مصباح یزدی مدظلہ کی گرانقدر کتاب" کاوشھا و چالشھا " کو جناب مولانا سید عترت حسین رضوی نے اردو زبان میں اپنے ترجمہ سے آراستہ کیا ہے جس کے لئے ہم دونوں کے شکر گزار ہیں اور مزید توفیقات کے آرزومند ہیں، اسی منزل میں ہم اپنے تمام دوستوں اور معاونین کا بھی صمیم قلب سے

شکریہ ادا کرتے ہیں کہ جنھوں نے اس کتاب کے منظر عام تک آنے میں کسی بھی عنوان سے زحمت اٹھائی ہے، خدا کرے کہ ثقافتی میدان میں یہ ادنیٰ جہاد رضائے مولیٰ کا باعث قرار پائے۔

والسلام مع الاکرام

مدیر امور ثقافت، مجمع جہانی اہل بیت

پیش گفتار

حوزۂ علمیہ اور یونیورسٹی کے درمیان ارتباط ایک مبارک شئے ہے جسکے نتیجے بہت ہی اچھے سامنے آرہے ہیں اسکے برخلاف معاشرہ پراثر انداز ہونے والے ان دو رکنوں میں جدائی بہت ہی بڑے نقصان کا سبب بنتی ہے۔اس طرف توّجہ دینے اور اس نیک ارتباط کو برقرار رکھنے کے لئے انقلاب اسلامی سے پہلے حوزۂ علمیہ اور یونیورسٹی دونوں طرف کے بہت سے لوگ اس کام میں فعّال تھے اور اس مسئلہ کی اہمیت کومحسوس کرتے تھے اور اسکی اسٹراٹجی اہمیت کی وجہ سے ہمیشہ یہ کوشش کرتے تھے کہ یہ وسیع اور مستحکم رابطہ برقرار رہے۔

مختلف بے نظیر شخصیات جیسے شہید بہشتی ؛شہید مطہری ؛شہید مفتّح ؛ڈاکٹر باہنر اور دوسرے دور اندیش عالموں کا یونیورسٹی میں آنا انکی روشن بینی اور تیز نظری کی علامت اور اس ارتباط کو بڑھانے میں اہم قدم تھا،یونیورسٹیوں کے ایسے متعدد اساتید کی بھی نشان دہی کی جاسکتی ہے جن لوگوں نے اس ارتباط کی ضرورت اور اہمیت پر اعتقاد رکھتے ہوئے اس ضمن میں بہت کوشش کی ہے یہ کوششیں انقلاب اسلامی کی کامیابی اور یونیورسٹی اور حوزہ کے درمیان اتحاد کے نعرے کے بعد جو کہ انقلاب اسلامی کے معمار بزرگ حضرت امام خمینیؒ کی طرف سے دیا گیا تھا بہت وسیع ہوگئیں، اگر چہ اس وقت بھی اس راستے میں بہت سی رکاوٹیں اور مشکلات ہیں نیز منزل مقصود تک پہونچنے کے لئے راستے میں بہت سے مشکلات پائے جاتے ہیں لہٰذا پہلے ان کو دور کیا جائے لیکن پھر بھی چشم دید تجربے اس بات کو بتاتے ہیں کہ ان

دونوں صنفوں یعنی حوزہ اور یونیورسٹی کے درمیان نزدیکی اور رابطہ جتنا زیادہ ہوگا] کیونکہ یہ دونوں محکم قلعے ہیں[اور جس قدر دونوں صنف کے افراد کے خیال اور تفکّر نتیجے تک پہونچانے والے ہونگے وہ قوم کے لئے مفید ہوگا اور معاشرہ انکے فوائد سے مستفید ہوگا اسکے برخلاف ان کے درمیان جدائی خود انکے اور معاشرہ دونوں کیلئے نقصان دہ ہوگی۔

منجملہ ان لوگوں کے جنھوں نے برسوں پہلے سے اس رابطہ کی ضرورت اور اہمیت پر بہت زور دیا ہے مفکّر یگانہ، فقیہ بزرگ، حضرت آیت.. مصباح یزدی دام ظلہ ہیں، ثقافتی انقلاب کے سلسلے میں جو کہ انقلاب کے شروع ہی میں امام خمینی کے حکم سے انجام پایا تھا خود آقائے مصباح یزدی امام خمینی کے خاص معتمدین میں سے تھے اور اس تحریک اور پروگرام کو بنانے نیز اسے آگے بڑھانے کے لئے امام کی طرف سے آپ معیّن تھے، یہ خود اس بات کی گواہی ہے کہ جناب استاد مصباح یزدی مختلف سالوں سے اس ارتباط پر نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔اسی رابطہ کے ذیل میں ایک سال یا کچھ زیادہ وقت سے یونیورسٹی کے بعض متعہّد اور متفکّر اساتید نے ایک شعبہ اسی مقصد سے قائم کیا ہے منجملہ اور کاموں کے ایک ماہانہ نشست بھی آقائے مصباح یزدی کی موجودگی میں منعقد ہوتی ہے ان نششتوں میں اساتید جو عنوان پیش کرتے ہیں، استاد محترم انھیں عنوان پر بحث اور گفتگو کرتے ہیں نششتوں کو منعقد کرنے والی تنظیم]شعبہ اساتید دانشگاہ علم وصنعت[کی یہ خواہش تھی کہ چونکہ یہ تقریریں علمی لحاظ سے بہت عمدہ ہیں نیز اس وقت معاشرہ کو اس کی ضرورت بھی ہے لہٰذا ان کو بالترتیب چھاپ کر لوگوں تک پہونچایا جائے خدا کا شکر ہے کہ اس وقت محمد مہدی نادری قمی (جو کہ موسّسہ

آموزشی اور پژوہشی امام خمینی کے رکن اور جناب استاد کے شاگرد بھی ہیں) کی کوششوں سے نو(۹)تقریروں کو کتاب حاضر کی شکل میں پیش کیا جارہا ہے امیّد ہے کہ آئندہ بھی اس سلسلہ کو جاری رکھتے ہوئے ملک کے علمی ،ادبی ،اور ،وہ تمام افراد جو علم سے شغف رکھنے والے ہیں انکی خدمت میں یہ مطالب پیش کرتے رہیں گے۔

انتشارات موسّسہ پژوہشی امام خمینی

تہذیب و ثقافت کے سلسلے میں ہماری ذمہ داری (۱)

خداوند عالم کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے محترم اساتید کے درمیان حاضر ہونے کی توفیق عطا فرمائی امید کرتا ہوں کہ یہ نیک اور مبارک قدم ہوگا ان عظیم اور سنگین ذمہ داریوں کو انجام دینے کی جو ذمہ داریاں اس خاص دور میں ہمارے اوپر عائد ہیں سب سے پہلے میں اس بات کی اجازت چاہتا ہوں کہ ایک مختصر مقدّمہ جو اس ذمہ داری سے متعلّق ہے اسکو بیان کروں اسکے بعد اللہ کے فضل وکرم سے آئندہ جلسوں کے جو موضوعات دوستوں کے سامنے ہیں ان کے بارے میں تفصیل سے بحث کروں گا

مذہب اسلام مین ایک دستور (قاعدہ) ہے" طاقت کے مطابق ذمہ داری" یعنی خداوند عالم نے جسکو جتنی نعمت عطا کی ہے اور جس قوّت و استعداد کا اسکو مالک بنایا ہے اسی کے مطابق اسکو ذمہ داری عطا کی ہے (انسان کی ذمہ داری) یہ ایک ایسا اہم موضوع ہے جو بہت ہی زیادہ تفصیل چاہتا ہے اس سے پہلے کہ اصل موضوع" قوت و طاقت کے اعتبار سے ذمہ داری" کے بارے میں بحث ہو اس سلسلے میں مختصر وضاحت پیش کی جاتی ہے۔

انسان جواب دہ ہے یا حقوق طلب

اس بات کے علاوہ کہ انسان خود فطری طور پر اس بات کو محسوس کرتا ہے کہ وہ جانوروں کی طرح آزاد نہیں ہے کہ بغیر ذمہ داری کے جیسے چاہے ویسے زندگی بسر کرے، مختلف ادیان بھی اس

بات پر تاکید کرتے ہیں شاید آپ نے سنا ہوگا مشہور فلسفی" امانوئل کانٹ" کہتا ہے کہ دنیا میں دو چیزوں نے مجھکو بیحد متأثر کیا ہے اور میرے لئے تعجب اور حیرانی کا باعث ہیں ایک آسمان میں ستاروں کا ہونا دوسرے انسان کے اندر اسکی فطرت کی آواز، اور فطرت بہت ہی خوبصورت آواز ہے جو انسان کے اندر موجود ہے بہر حال انسان اپنی اس فطرت اوّلیہ کے باعث کم وبیش اس بات کا احساس کرتا ہے کہ ایک طرح کی ذمہ داری اسکے اوپر ہے البتہ اس فطری احساس کا واضح اور ثابت ہونا یہ ایک علیحدہ بحث ہے جس کو اس وقت بیان کرنا مقصود نہیں ہے۔

انسان فطرتاً جواب دہ اور ذمہ دار ہے اس نظریہ کے مقابل ایک دوسرا قدیمی نظریہ جو پایا جاتا ہے اور آخری چند برسوں میں اسے خاص رونق وشہرت ملی ہے وہ یہ کہ انسان کو اپنے حقوق حاصل کرنے اور لینے کے لئے جہان، طبیعت، خدا اور حکومت سے کوشش کرنی چاہیئے یہ فکر پرانی ہو چکی ہے کہ انسان ذمہ دار اور مکلّف ہے یہ گذرے ہوئے زمانے کی باتیں ہیں اب وہ زمانہ ختم ہو چکا ہے کہ انسان کو سکھایا جائے کہ وہ بندہ ہے اور خدا اسکا مولا ہے بلکہ اب وہ زمانہ ہے کہ انسان ہی آقا مولا ہے آج وہ دور نہیں رہا کہ انسان تکلیف اور ذمہ داری کے پیچھے دوڑے بلکہ زمانے نے اسکے جن حقوق کو بھلا دیا یا ضائع کر دیا ہے ان کے لئے کوشش کرے۔

بہر حال اس دوسرے نظریہ کے برخلاف، جیسا کہ اشارہ کیا گیا ہے عقل ووجدان اور انسانی فطرت گواہ ہیں کہ انسان ذمہ دار ہے اور ذمہ داریاں اسکو گھیرے ہوے ہیں اور انسان ذمہ

داریوں کا جواب دینے والا ہے تمام ادیان بھی اس بات پر اتّفاق رکھتے ہیں، قرآن کریم کی اکثر آیات انسان کے ذمہ دار ہونے کو بتاتی ہیں قرآن مجید میں خدا فرماتا ہے:

"فوربّك لنسئلنّهم اجمعين عمّا كانوا يعملون" (۱)

تمہارے خدا کی قسم جو کچھ وہ انجام دیتے ہیں اسکے بارے میں سوال کیا جائے گا" پھر ارشاد ہو رہا ہے:

"ولتسئلنّ عمّا تعملون" (۲)

یعنی تم جو کچھ بھی انجام دیتے ہو اس کے بارے میں ضرور ضرور سوال ہوگا ایک جگہ اور ارشاد ہوتا ہے:

"انّ السمع والبصر والفواد كل اولٰيك كان عنه مسئولا" (۳)

یعنی آنکھ کان اور دل سب کے بارے میں سوال ہوگا۔

....

(۱) سورہ حجر: آیہ ۹۲و۹۳۔

(۲) سورہ نحل: آیہ ۹۳۔

(۳) سورہ اسرا: آیہ ۳۶

اور بندوں سے سوال کے بارے میں دوسری جگہ اسی قرآن میں ارشاد فرماتا ہے:

"وقفوهم انهم مسئولون" (۱)

ان لوگوں کو روکو ان سے سوال کرنا ہے ایک جگہ اور قرآن میں فرماتا ہے:

"وكان عهد الله مسئولا" (۲)

اورخدا کا عہدو پیمان ہمیشہ قابل سوال ہے" ایک جگہ اور فرماتا ہے

"ثم لتسئلنّ یو مئذٍ عن النعیم "(۳)ا

اس دن (قیامت کے دن) خدا کی نعمت کے بارے میں سوال ہوگا"۔

....

(۱) سورہ صافات: آیہ ۲٤۔

.(۲) سورہ احزاب: آیہ ۱۵۔

(۳) سورہ تکاثر: آیہ ٦۔

طاقت اور ذمہ داری کا توازن

انسان اپنے اوپر ذمہ داری رکھتا ہے اس اصل میں کوئی بحث نہیں ہے لیکن جس نکتہ کی طرف توّجہ دینے کی ضرورت ہے وہ یہ کہ یہ ذمہ داری ہر دور میں سبھی لوگوں پر برابر نہیں ہے بلکہ مختلف وجوہ کی بنا پر ہر ایک پر علیحدہ طریقے سے عائد ہوتی ہے اور سب پر الگ الگ طرح سے ہے۔

ایک وجہ جو ایک شخص کے لیۓ ذمہ داری کو دوسرے سے جدا کرتی ہے وہ یہی طاقت وقوّت ہے جو ہر ایک میں الگ الگ پائی جاتی ہے یہ وہی قاعدہ (طاقت کے مطابق ذمہ داری) ہے جسکی طرف ہم نے شروع میں اشارہ کیا، چونکہ لوگوں کی طاقت وقوّت، انکی ذہنی استعداد، انکی جسمانی اور روحانی طاقت نیز انکا اجتماعی مقام وغیرہ ایک جیسا نہیں ہے لہٰذا ان افراد کی ذمہ داری بھی ایک جیسی نہیں ہے، قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:" لا یکلّف اللہ نفساً الاّ

وسعھا" (۱) یعنی خدا کسی کو قدرت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا ہے،اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک کام جو صدر یا وزیر اعظم اپنے منصب ومقام کے سبب انجام دے سکتا ہے وہ ایک معمولی عہدہ پر رہنے والا انجام نہیں دے سکتا اسی اعتبار سے ان لوگوں کی ذمہ داری بھی جدا جدا ہے اور سب کی ذمہ داری ایک جیسی نہیں ہو سکتی۔

....

(۱) سورہ بقرہ: آیہ ۲۸٦۔

ایک دوسری وجہ جو کہ ذمہ داری کے حوالے سے کمی یا زیادتی کا سبب بنتی ہے وہ ان خطرات کا شدید یا ضعیف ہونا ہے جو کہ ایک شخص یا پوری قوم کو درپیش ہوتا ہے جس قدر خطرات شدید ہونگے اسی اعتبار سے ذمہ داری بھی سخت ہوگی اگر ماحول پوری طرح سے پرامن ہے اور ساری چیزیں کنٹرول میں ہیں تو رات کے وقت بھی آپ سکون وآرام سے سو سکیں گے لیکن اگر قوم ومعاشرے کے اندر نا امنی پائی جاتی ہے اسکے محافظ اور چوکیدار کمزور ہیں چور اور اوباش کا خطرہ زیادہ ہے تو گھر، مال واسباب، بیوی بچوّں کی حفاظت کے حوالے سے آپ کی ذمہ داری میں اضافہ ہو جائے گا اگر یہ بات عام ہو جائے کہ بازار میں زہریلی غذا ئیں پائی جاتی ہیں تو انسان اس سے بچنے کی تدابیر کے بارے میں غور وفکر کرے گا اور ایک خاص ذمہ داری کا احساس کرے گا۔بہر حال خطرہ جتنا زیادہ بڑا ہوگا اتنا ہی انسان کے اندر ذمہ داری کا احساس زیادہ ہوگا اور وہ سوچے گا کہ ایسی حکمت عملی اختیار کرے جسکی وجہ سے وہ خطرات سے دور رہ سکے۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ یہ قاعدہ مقام اثبات سے مربوط

ہے یعنی جب ہم خطرہ کو لمس اور محسوس کریں یا احتمال ہو کہ خطرہ موجود ہے یا خطرہ کا امکان پایا جا رہا ہو یعنی خطرہ کا ہونا کسی بھی طرح ہمارے لیئے ثابت ہو جائے، لیکن کبھی کبھی واقعاً اور حقیقتاً خطرہ موجود رہتا ہے مگر چونکہ ہم اس سے ناواقف ہیں یا خطرہ ہمارے لیئے ثابت ہی نہیں ہوتا لہٰذا اس سے بچنے کی تدابیر نہیں کرتے چاہے یہ خطرہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو جب ہم کو اطلاع ہی نہیں ہے تو اس سے نمٹنے کے لئے کچھ بھی نہیں کرینگے لہٰذا پہلے خطرہ کا احساس کریں پھر اسکے بعد اپنی ذمہ داریوں کو اس کے مقابلے میں درک کریں۔

حوزئہ علمیہ اور یونیورسٹی کے اساتذہ کی ذمہ داریاں

بہر حال جو کچھ اس تقریر میں آپ لوگوں سے مربوط ہے وہ یہ کہ مختلف لحاظ سے دوسروں کی بہ نسبت آپ لوگوں کی ذمہ داریاں سنگین اور زیادہ ہیں۔ جن میں ایک وجہ یہ ہے کہ خداوند عالم نے آپ کو ذاتی قوّت و استعداد عنایت کی ہے اگر یہ عنایت نہ ہوتی تو آپ یونیورسٹی کے استاد نہ ہوتے یہی ہوش اور علمی صلاحیت نیز اعلیٰ تحقیق و تعلیم جو آپ کے پاس ہے اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ آپ کی صلاحیت دوسرے لوگوں سے زیادہ ہے۔

دوسرے یہ کہ اجتماعی حیثیت کی وجہ سے جو اثر نوجوان افراد اور طالب علموں پر آپ ڈال سکتے ہیں اسکی وجہ سے آپ کی ذمہ داری زیادہ ہو جاتی ہے اس لئے کہ معمولی افراد حتیٰ ادارے اور وزارتی امور کے ذمہ دار بھی نوجوانوں پر وہ اثر نہیں ڈال سکتے جو آپ لوگوں کی ذات سے ممکن ہے آپ ہی حضرات نوجوانوں کی تربیت اور انکی فکروں کو پختہ کر کے در

حقیقت ملک کو مضبوط بناتے ہیں اور آئندہ کی تاریخ رقم کرتے ہیں یہی وہ نوجوان ہیں جو بہت جلد ملک کے عظیم عہدہ پر فائز ہونگے رہبر سے لیکر صدر یا پارلیمانی امور کے ممبران اور دوسرے عہدوں پر متمکّن ہونے والے افراد سب کے سب اسی حوزۂ علمیہ اور یونیورسٹی کے جوانوں میں سے ہونگے اب استاد چاہے یونیورسٹی کا ہو یا حوزۂ علمیہ کا اس کی ذمہ داری اس لحاظ سے عظیم اور دوسروں کی بہ نسبت زیادہ سنگین ہے تیسری بات جو ہماری اور آپ کی ذمہ داریوں کے زیادہ سنگین ہونے کا سبب ہے وہ درحقیقت زمانے کے خاص حالات کے تحت ہے اس وقت ہم ایسے ماحول اور شرائط میں زندگی بسر کر رہے ہیں جہاں دشمن کا خطرہ خاص طور پر آداب ورسوم نیز تہذیب وتمدّن کے لحاظ سے بہت زیادہ ہے اور ہم دشمن کے حملہ اور اسکے نفوذ کو اچھی طرح محسوس کر رہے ہیں۔ کل تک جو کہہ رہے تھے کہ یہ ایک کلچر اور تہذیب کا دوسرے کلچر اور تہذیب کے ساتھ معاملہ اور تبادلہ ہے اور اسے سازش کہنا ایک وہم ہے۔ میں یہ نہیں سمجھتا کہ جو لوگ تھوڑی سی بھی عقل وفکر رکھتے ہیں یا ان کے اندر تھوڑی سی بھی سوجھ، بوجھ موجود ہے ان پر یہ حقیقت پوشیدہ ہوگی تہذیب اور کلچر کا خطرہ اس معاشرہ میں، خاص طور پر نوجوانوں کے لیئے بہت خطرناک ہے اگر ہم نے دیر کی اور دشمن کے نفوذ اور انکے اثرات کو نہیں روکا تو بہت جلد ہم اس بات کا مشاہدہ کرینگے کہ ہماری تہذیب اور ہمارا کلچر بالکل پوری طرح سے بدل چکا ہوگا آجکل دشمن کے ہاتھ میں نئے الکٹرانک وسائل، سٹلائٹ، اینٹرنیٹ اور دوسرے امکانات پہلے سے زیادہ منظّم طریقے سے پائے جاتے ہیں اور دشمن اپنی کوشش اور فعالیت کو روز بروز بڑھا رہا ہے اور بہت تیزی سے کہ جس

کا تصوّر بھی نہیں کیا جاسکتا یکے بعد دیگرے تہذیب وتمدّن کے قلعے مسمار کئے جارہا ہے۔

آج کی دنیا میں تہذیبی اور اخلاقی انحطاط

آج دنیا میں اخلاقی اور تہذیبی آلودگی اور پستی کا عالم یہ ہے کہ مغربی ممالک کے افراد بھی اس سے تنگ آگئے ہیں اور وہ لوگ خود اس کے خلاف آواز بلند کررہے ہیں یقینا آپ لوگ مجھ سے بہتر جانتے ہونگے یہاں صرف ایک مورد کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے (جو ہزاروں میں ایک ہے)۔

قرآن کریم میں ایک واقعہ ذکر ہوا ہے جسکی اس نے سختی سے مذمّت کی ہے اور وہ قوم لوط کا واقعہ ہے۔ قوم لوط کے لوگ اس برے فعل کو انجام دیتے تھے اور وہ لوگ اس بری بیماری میں مبتلا تھے وہ لوگ اپنی شہوانی خواہشات کی آگ کو اپنی ہی جنس کے افراد سے بجھاتے تھے جبکہ جنسی خواہشات کی تسکین کے لئے صنف مخالف موجود تھیں انکے اس عمل کو بہت ہی بری صفت قرار دیا ہے۔

خداوندعالم ارشاد فرماتا ہے:

"انّکم لتاتون الفاحشة ما سبقکم بها من احد من العالمین" (۱)

یعنی تم لوگ ایسا برا فعل انجام دیتے ہو کہ تم سے پہلے کے لوگوں میں سے کسی نے اس فعل کو انجام نہیں دیا۔ آخر کار وہ لوگ اسی برے کام پر مصر رہے اور ان لوگوں نے حضرت لوط کے موعظہ اور نصیحت پر کوئی توّجہ نہیں دی پھر خداوندعالم نے ان پر عذاب نازل کیا اوران

لوگوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا۔ یہ قصّہ ایک

....

(۱) سورہ عنکبوت: آیہ ۲۸۔

چھوٹے شہر میں وہ بھی دنیا کے ایک کنارے بسنے والے ہزاروں سال پہلے چندافراد سے متعلّق تھا لیکن آج آپ دنیا میں دیکھیں کہ کیا ہورہا ہے خود مغربی مما لک کے افراد جو عندیہ اوراشارہ دے رہے ہیں اسی اندازے کے مطابق دنیا کے تقریباً پچاس فیصدی سے زیادہ بڑے بڑے لوگ اس بری عادت میں مبتلا ہیں حتّیٰ بات یہاں تک پہونچ گئی ہے کہ لوگ ہم جنسوں کی حمایت میں کھلے عام پر سڑکوں پر آکر مظاہرہ کرتے ہیں اور ریلی نکالتے ہیں بعض مما لک میں پارلیمانی امور کے ممبران نے سرکاری طور پر اس قانون کو منظور کروا یا ہے اور قانون بنا کر اسکو جائز قرار دیا ہے آج دنیا کے بہت سے علاقوں میں ہم جنسوں نے تنظیم اور کلب کے ساتھ اپنے لئے مخصوص جگہیں بنا لی ہیں اسکے علاوہ بعض رسالے اور کتاب خانے بھی انھیں سے مخصوص ہیں۔

اگر میں اپنی آنکھ سے نہ دیکھتا تو یقین نہ کرتا ایک بار جب میں نے امریکہ کے شہر فیلا ڈیلفنا کا سفر کیا اور موقع ملنے پر بعض شہروں کو دیکھنے گیا انھیں میں سے ایک واشنگٹن شہر بھی تھا ایک دوست]جو کہ آجکل ایران میں نائب وزیر ہیں[انکے ساتھ گاڑی پر سوار ہوکر جا رہا تھا راستے میں ایک چوراہے پر بہت بڑا کتب خانہ نظر آیا میں نے اپنے دوست سے کہا کہ بہتر ہے اس لائبریری کو دیکھتے ہوئے چلیں انھوں نے جواب دیا یہاں اترنا بہتر نہیں ہے

میں نے اسکا سبب پوچھا تو کہنے لگے کہ یہ لائبریری ہم جنسوں کی ہے اگر ہم یہاں اتر گئے تو ہمیں برائی سے متّہم کیا جائے گا۔ میں نے اسی چوراہے پر بہت سے مردوں کو عورتوں کا مختصر لباس پہنے ہوئے دیکھا جو اپنے کو سجا سنوار کر دوسروں کے لئے پیش کر رہے تھے۔ یہ آج دنیا کی حالت ہے کس قدر بے شرمی اور ذلّت کا کام ہے!

اب آپ خود ہی تصوّر کریں ذرائع ابلاغ اور انٹرنیٹ وغیرہ کے ذریعہ کتنی جلدی اور آسانی کے ساتھ اخلاق کو خراب کرنے والے ان جراثیم کو پھیلایا جا سکتا ہے ایسے ہی نہیں مغربی ممالک کے ماہرین تعلیم اور نفسیات سے واقفیت رکھنے والے افراد نے خطرے کا اعلان کیا ہے انھوں نے بچّوں کے غیر اخلاقی باتوں سے آگاہ ہونے اور انٹرنیٹ وغیرہ سے ہیجان انگیز تصاویر کے نہ دیکھنے پر سختی سے تاکید کی ہے آج ہالیوڈ جدید قسم کے تکنیکی اور فنّی وسائل سے ایسی جذّاب اور پر کشش فلمیں بنا کر ساری دنیا میں نشر کر رہا ہے جس میں اخلاق کے خلاف بہت ہی غلط تبلیغ کی جا رہی ہے۔ اے کاش یہ سلسلہ یہیں پر ختم ہو جاتا مگر ایسا نہیں ہے اس سے بڑا ابھی خطرہ پایا جا رہا ہے اور وہ فکری انحراف کا خطرہ ہے جس طرح اخلاقی برائیاں آج کی دنیا میں بے نظیر ہیں ویسے ہی فکری انحراف بھی آج کل روز بروز بڑھتا جا رہا ہے کہ اب تک کسی شیطان کے ذریعہ یہ کام انجام نہیں پایا آج تک انسانی عقیدے کو خراب کرنے کا ذریعہ ابلیس تھا لیکن اگر وہ بھی بعض انسان نما شیطانوں کی حرکت اور ان کے کرتوت کو ملاحظہ کر لے تو دانتوں تلے انگلی دبا لے انھوں نے ایسا ماحول بنا لیا ہے اور وہ ایسا چھا گئے ہیں کہ اگر کوئی کہتا ہے میں فلاں چیز پر یقین رکھتا ہوں تو یہ کہتے ہیں کہ عجب بیوقوف اور نا سمجھ انسان

ہے! ہاں آجکل کے روشن فکروں کی اصطلاح میں انسان کو فخر اسی بات پر ہے کہ وہ یہ کہے ہم کو تمام چیزوں میں شک و شبہ ہے اور کوئی بھی چیز دنیا میں یقینی اور ثابت نہیں ہے اور نہ کوئی چیز یقین کرنے کے قابل ہے۔

ہر زمانے میں اسباب ہدایت و گمراہی کے درمیان نسبی توازن کا تحفظ

وہ چیز جو جاننے کے قابل ہے یہ کہ خداوند عالم کی وسیع حکمت اس بات کی متقاضی ہے کہ ہر زمانے میں جس قدر برائیاں اور اخلاق کو گمراہ کرنے والی چیزوں کی زیادتیاں اور انکے اسباب کی کثرت ہوگی اسی اعتبار سے انسانوں کو راہ راست اور ہدایت کی طرف لے جانے کے اسباب بھی فراہم ہونگے یعنی خداوند عالم ہر زمانے میں ہدایت اور ضلالت دونوں طرف کے توازن کو برقرار رکھتا ہے اور اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ گمراہی کا ماحول معاشرہ پر اس قدر غالب ہو جائے کہ جو طالب ہدایت ہیں وہ اس سے محروم رہ جائیں۔ اگر آج اطلاعات اور مواصلات کے نئے نئے ذرائع گمراہیوں کے لئے فراہم ہیں تو یہی نئی ایجادات اور وسائل انسان کی ہدایت اور اصلاح کا ذریعہ بھی بنتے ہیں جبکہ یہ اسباب پہلے نہیں پائے جاتے تھے۔ آج دنیا میں ایسے بہت سے افراد ہیں جنھوں نے اسلام کو انٹرنیٹ کے ذریعہ پہچانا ہے اور وہ مسلمان ہو گئے ہیں۔ اگر ریڈیو، ٹی وی، سنیما، انٹرنیٹ اور سٹلائٹ وغیرہ لوگوں کو گمراہ، فکروں کو خراب اور انکے اخلاق کو پست کرنے کے لئے استعمال ہوتے ہیں تو

انہیں ذرائع کے ذریعہ بہت سے لوگ اسلام، انقلاب، ایران اور امام خمینیکے نام سے واقف اور آگاہ ہوئے ہیں اور انکی جانب متوجّہ ہوکر وہ مسلمان ہو گئے ہیں۔ دنیا میں بہت سے حصّوں کے مسلمانوں نے جب سٹلائیٹ اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ امام خمینی کے پیغام کو سنا اور انکے راستے سے متعارف ہوئے تو ان لوگوں نے شیعہ مذہب کو اختیار کرلیا۔

ایک بار میں سنگاپور میں ایک تاجر کا مہمان ہوا اسکی تجارت کمپیوٹر سے متعلّق تھی اس نے بتایا کہ شروع میں میں وہابی تھا لیکن جب میں نے امام خمینی کے متعلّق معلومات حاصل کی اور انکی باتوں کو سنا اور انکی تحریک کا مشاہدہ کیا تو معلوم ہوا کہ واقعی اسلام یہی ہے جسکو امام خمینی بتا رہے ہیں بہرحال اسکے بعد میں نے شعیہ مذہب قبول کرلیا۔

میرا وہ سفر جو امریکہ کے چند جنوبی ممالک سے متعلّق تھا جیسا کہ مجھے یاد ہے ان میں ایک ملک شیلی بھی تھا اس ملک کے ذمہ داروں اور یونیورسٹی کے سربراہان نے مجھ سے کہا کہ ہم اپنے ملک کے جوان طبقہ اور انکے مستقبل کے سلسلے میں بہت فکرمند ہیں ہماری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کیا کریں؟ ہم ان نوجوانوں کو اس یونیورسٹی میں آپ کے حوالے کرتے ہیں آپ انکی تربیت اپنی روش کے مطابق انجام دیں ہم آپ کو تمام سہولیات دیتے ہیں آپ ایک پروگرام کے تحت انکی تربیت کریں اس لئے کہ ہم کو اطمینان ہے کہ دنیا میں تربیت کے جتنے ذرائع ہیں ان میں مسلمانوں کی روش سب سے بہتر ہے۔ اس یونیورسٹی کا نائب مختلف شعبوں کو پہچنوانے اور اس کی راہنمائی کے لئے ہمارے ساتھ تھا جب ظہر کا وقت ہوا تو ہم نے کہا ہم ظہر کی نماز پڑھنا چاہتے ہیں چنانچہ ایک جگہ ہمارے لئے معیّن ہوئی اور ہم لوگ نماز پڑھنے

میں مشغول ہوگئے یونیورسٹی کا نائب جو کہ عیسائی تھا اس نے بھی ہم لوگوں کے ساتھ نماز پڑھی ہمیں بہت تعجّب ہوا اس نے کہا کہ مجھے نہیں معلوم آپ لوگ نماز میں کیا پڑھتے اور کیا کہتے ہیں؟ لیکن یہ سجدہ کی حالت مجھکو بہت اچھی لگی اور میرے اندر یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں بھی نماز پڑھوں۔

ہاوانا] یہ ایک ایسے ملک کی راجدھانی ہے جو پچاس سال تک کمیونزم کے زیر تسلّط رہ چکا ہے اور آج بھی ہے [وہاں کے ایک بزرگ پروفیسر جو کہ پیدائشی طور پر اسپین کے رہنے والے ہیں اور وہاں تاریخ کے استاد ہیں وہاں جتنے بھی اساتید ہماری میزبانی کررہے تھے ان لوگوں کے درمیان یہ شخص بلند ہوا اور تقریر کرتے ہوئے اس نے کہا کہ میں جوانی کے عالم میں اس بات کی خواہش رکھتا تھا کہ میں دوشخصیات کے بارے میں مطالعہ کروں اور تحقیقات کرکے تفصیلی معلومات حاصل کروں ایک پیغمبر اسلام] جو کہ ایک عالمی شخصیت کے مالک تھے [دوسرے خیّام جو کہ ایک ایرانی دانشمند ہے لیکن آج کل کافی دنوں سے میرے اندر ایک نئی شخصیت کے بارے میں جستجو کرنے کی خواہش ہوگئی ہے جس خواہش نے ان دونوں پرانی خواہشوں کو بھلا دیا ہے آج میں چاہتا ہوں کہ ایک ایسی شخصیت کے بارے میں معلومات حاصل کروں جس نے دنیا میں انقلاب برپا کردیا ہے اور وہ ذات امام خمینی کی ہے یہاں پر وہ" ہاوانا" کا ضعیف استاد جذباتی ہوگیا اس نے اپنے اندر عجیب کیفیت پیدا کرلی وہ دوبار میرے سامنے جھکا اور اس نے میرے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور خواہش کی کہ ایک اسپینی زبان میں ترجمہ شدہ قرآن اسکو دوں کہاں" ہاوانا" جہاں نصف صدی تک کمیونسٹ کی حکومت تھی

وہاں ایک یونیورسٹی کا استاد جو کہ سب سے ضعیف تھا اسکی یہ خواہش؟

میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم یہ تصوّر نہ کریں کہ گمراہی کے وسائل بہت زیادہ ہو گئے ہیں اور گمراہی ہر طرف پھیل چکی ہے اب کچھ بھی ہونے والا نہیں ہے پانی سر سے اوپر ہو چکا ہے چاہے ایک بالشت ہو یا سو بالشت، ڈومنے کے لئے کافی ہے یہ تصوّر بالکل غلط ہے مایوسی اور ناامّدی کی حالت ہمارے اندر کبھی بھی نہیں ہونا چاہئے، خداوند عالم نے اس دنیا کو انسان کی ترّقی اور کمال کے لئے پیدا کیا ہے اس کی ذات اس بات سے منزّہ ہے کہ دنیا کو چھوڑ دے اور کچھ شیطان نما انسانوں کے حوالے کر دے اور لا پرواہ ہو جائے ایسا ہر گز نہیں ہے، اگر گمراہی اور انحرافات کے وسائل زیادہ ہیں تو ہدایت و اصلاح کے راستے بھی نئے نئے سامنے آرہے ہیں جو کسی بھی پیغمبر اور امام کے زمانے میں موجود نہیں تھے۔

وہ اجتماعی حالات جو آج سماج اور قوم کو بدلنے کے لئے ہیں وہ اس سے پہلے کبھی نہیں پائے جاتے تھے آپ اسکا نمونہ ایرانی انقلاب اور آٹھ سالہ دفاع مقدّس کے تناظر میں دیکھ سکتے ہیں۔

یہی جوان جو کہ شاہ کے دور میں پلے بڑھے تھے انکے اندر ایسا انقلاب اور تحوّل آیا کہ وہ با ایمان اور صاحب عرفان ہو گئے کہ ان لوگوں نے ۸ سالہ جنگ کو بہت ہی افتخار اور سر بلندی کے ساتھ فتح کیا اسی دفاع مقدّس میں ایسی قربانی دیکھی گئی جسکی کوئی مثال نہیں ملتی ان لوگوں نے لاجواب اور بے نظیر قربانی پیش کی، ان لوگوں نے انقلاب کو زندۂ جاوید کر دیا۔ اگر آپ اس زمانے میں اپنی کلاسوں میں ملاحظہ کریں گے تو آپ کو ایسے نوجوان مل جائیں گے جو

عرفانی مطالب کو حاصل کرنے کے لئے اسی قدر والہانہ جذبہ رکھتے ہیں کہ گویا سو سال کی منزل کو ایک دن میں طے کرلیں اگر انکی ہدایت اور راہنمائی صحیح طریقے سے کی جائے تو ان میں صبر و ایثار، جذبہ وفداکاری کی نیز دنیاوی لذّات سے اپنے کو بچانے کی قوت وصلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے یہ سب ایسی چیزیں ہیں جن کا ہم نے انقلاب کے دوران اور جنگی محاذ پر مشاہدہ کیا ہے اور ایسی مثالوں کو دیکھا ہے اس نوجوان نسل کی ہدایت] جو کہ بہترین صلاحیت رکھتے ہیں اور انکی فطرت پاک و پاکیزہ ہے [اور ان کی راہنمائی آج ہم اور آپ اساتید کے کاندھوں پر ہے۔

اکثر بڑے انقلابات صاحبان علم کی فکروں کا نتیجہ

ہماری بحث ذمہ داری اور مسئولیت کے بارے میں تھی جو مطالب میں نے پیش کئے اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی ذمہ داریوں کو اور زیادہ محسوس کریں، اگر آپ توّجہ کریں تو دیکھیں گے کہ جو لوگ مختلف شعبوں میں کامیاب ہوئے ہیں اور دنیا کے مختلف حصّوں میں انقلاب لانے کا سبب واقع ہوئے ہیں نوے فیصد سے زیادہ افراد صاحبان علم ہیں یہ الگ بات ہے کہ وہ یونیورسٹی سے تعلّق رکھتے ہوں یا دینی مدارس سے، اقتصادی، اجتماعی، سیاسی اور دینی نیز اسی طرح کے اور دوسرے شعبوں میں آپ اکثر دیکھیں گے کہ شروع میں ایک شخص کی کوشش اور پلاننگ ہوتی ہے پھر دھیرے دھیرے اس میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور

آخر میں وہ بڑے انقلاب کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ یہ انقلاب اور تحوّل ہمیشہ مثبت اور مفید ہی رہا ہو ان میں منفی اور مضر تحوّلات بھی پائے جاتے ہیں بہت سے ایسے تحوّلات بھی ہیں جو کہ اپنے اندر بہت ہی وسیع پیمانے پر فکری اور اخلاقی انحرافات کے حامل ہیں اور وہ انحرافات بہت ہی خطرناک حد تک پہونچے ہوئے ہیں، انھیں میں سے ایک انحراف جس کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے مغرب کا جنسی اور اخلاقی انحراف ہے جس کے قائل خود مغربی ممالک کے افراد ہیں کہ اس انحراف کا سبب جرمنی کا مشہور ماہر نفسیات]زیگمونڈ فرویڈ[نے نفسیاتی بیماریوں کے اسباب وعلل کو دیکھ کر نتیجہ نکالا کہ اس جنسی اور اخلاقی انحراف کا سبب جنسی خواہش کا کچلا جانا اور غریزۂ جنسی کا دبایا جانا ہے اور اس پر پہرے کے سبب یہ انحراف ہو رہا ہے اس نے تحلیل وتجزیہ کیا اور اس بیماری کی وسعت کو کم کرنے اور اس سے بچنے کے لئے یہ رائے پیش کی کہ سماج اور معاشرے میں پوری طرح سے جنسی آزادی ہونی چاہئے۔

اگر چہ خود (فرویڈ) اس نظریہ کو ظاہر کرنے میں کوئی قصد وغرض نہیں رکھتا تھا لیکن پھر بھی بہر حال یہ نظریہ اس جنسی اور اخلاقی تنزّلی اور پستی کا باعث بنا جسکا ہم مغربی ممالک میں مشاہدہ کر رہے ہیں البتہ شہوت پرستی اور لوگوں کی ہوس رانی نیز غلط فائدہ اٹھانے والوں کی منفعت طلبی اور وقت سے فائدہ اٹھانے والوں کی کارفرمائیاں بھی اس چیز کے پھیلاؤ کا سبب بنی ہیں لیکن بہر حال پہلا قدم اسکے پھیلانے میں" فرویڈ" کا تھا، آج کل دنیا میں سب سے زیادہ فائدہ مند صنعت سیکس اور جنسی مسائل سے متعلّق ہے دنیا کی سب سے زیادہ بکنے والی فلمیں

سیکسی فلمیں ہیں اور ٹی وی پر جو چینل سیکسی فلمیں نشر کرتے ہیں وہی چینل دنیا میں سب سے زیادہ دیکھے جاتے ہیں ان تمام انحرافات کی جڑ اسی ایک ماہر نفسیات کی فکر تھی۔

فکری فساد و انحطاط کے متعلق بھی مارکس ازم کے تفکرّات اور اسکے غم انگیز نتیجوں کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے ستّر سال سے جو فلسفہ نصف کرۂ زمین پر حاکم تھا خود انھیں ملکوں اور جو لوگ ان ملکوں میں انکے پیرو تھے خود انھیں لوگوں کے اعتراف کے مطابق اسکے خطرناک نتائج سامنے آئے ،یہی مارکس ازم کا نظریہ تھا جس نے لاکھوں بے دین اور منکرین خدا کو پیدا کیا جو خدا اور دین سے شدّت جنگ کی ،نیز یہ نظریہ بھی ایک دوسرے جرمنی دانشور" مارکس" کا تھا یہ تو چند مضر اور نقصان دہ تحوّلات تھے،البتہ کچھ مثبت اور فائدہ مند تحولات بھی علماء اور دانشوروں نے ایجاد کئے ہیں جن سے ہم کو غافل نہیں ہونا چاہئے انقلاب جمہوری اسلامی ایران بیسویں صدی کا مہم ترین تحوّل و انقلاب ہے جس کا دوست اور دشمن سبھی نے اعتراف کیا ہے یہ ایک مذہبی عالم آیت...امام خمینی کی فکروں کا نتیجہ تھا امام خمینیکی شخصیت ایک سے زیادہ نہیں تھی اور اسلحہ،پیسہ وغیرہ کچھ بھی نہیں رکھتے تھے ان کے پاس صرف ایک بلند فکر تھی ایسی فکر کہ شروع میں تقریباً ۹۹ فیصد خاص دوست اور احباب بھی یقین نہیں رکھتے تھے کہ یہ فکر عملی ہو جائے گی لیکن سبھی لوگ گواہ ہیں کہ اس شخص نے دنیا سے الگ ایک چھوٹے اور معمولی مکان میں بیٹھ کر مشرق و مغرب کی دو بڑی طاقتوں کو مبہوت کر دیا یہ ایسے عالم میں ہوا کہ امام نہ شہرت کے طالب تھے اور نہ ہی حکومت کے خواہاں،جبکہ یہ عام بات ہے کہ کوئی استاد درس پڑھا کر نکلتا ہے تو تمام شاگرد اسکے پیچھے پیچھے چلتے ہیں لیکن امام اس بات کی بھی

اجازت نہیں دیتے تھے کہ کوئی انکے پیچھے چلے امام خمینی اگر کسی کو دیکھتے تھے تو اسکو منع کرتے تھے کہ وہ راستے میں انکے پیچھے پیچھے چلے، امام خمینی ایسے مرجع تھے کہ جنھوں نے بہت زمانے تک اپنے رسالہ عملیہ کو چھاپنے کی بھی اجازت نہیں دی اور جب اجازت دی تو اس شرط کے ساتھ کہ ایک پیسہ بھی سہم امام علیہم السلام کا اس میں خرچ نہ ہو میں خود اس بات کو جانتا ہوں کہ آپ کا رسالہ عملیہ کن لوگوں کے تعاون سے چھپا تھا آپ ایسی شخصیت تھے جو نہ قدرت کے طالب تھے اور نہ ہی شہرت کے خواہاں، بلکہ ان دونوں چیز سے گریزاں تھے۔

آپ کے اندر ایک فکر تھی کہ جس پر بھروسہ کرکے آپ نے ایک بہت بڑا انقلاب برپا کر دیا ایسا تحوّل جس نے دنیا کے سیاسی حالات کو درہم برہم کر دیا یہ سب ایک مثبت فکر کا نتیجہ ہے۔

بہرحال میں اس بات کی تاکید کرنا چاہتا ہوں ایک آدمی، ایک استاد خواہ وہ دینی مدرسے کا ہو یا یونیورسٹی کا (چاہے وہ مثبت ہو یا منفی) عالمی انقلاب برپا کرسکتا ہے۔ اگر ہم اس مسئلہ کی کی طرف توجّہ کریں تو ان ذمہ داریوں کے بوجھ اور اسکی اہمیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں پھر اس بات کے لئے آمادہ ہونگے کہ اس کے لئے وقت صرف کریں درس اور کلاس کو تعطیل کریں اور بیٹھ کر اس اہم مسئلہ کے بارے میں بحث اور گفتگو کریں اور ملک کے نوجوانوں کے بارے میں فکر کریں، اسلام اور اسلامی معاشرہ سے متعلّق جو کام انجام دینا ہے اسکو پہچانیں اور ان کے متعلق اپنا فریضہ انجام دیں ان تمام مطالب کی طرف توجّہ کرتے ہوئے بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس فریضہ اور ذمہ داری کو ادا کرنے کے لئے ہم کو کیا کرنا چاہئے اس کے جواب سے قبل ایک مقدمّہ بیان کرتا ہوں۔

تہذیبی انقلاب کی اہمیت

میں نہیں جانتا کہ آپ لوگوں کو کتنا یاد ہے لیکن انقلاب اسلامی کے شروع ہی میں مرحوم امام خمینی نے ثقافتی اور تہذیبی انقلاب کے مسئلہ کو پیش کیا اور بہت سے ملک کے تعلیمی ادارے بند ہو گئے تو مختلف ممالک سے لوگ آئے تا کہ اس بات کو ملاحظہ کریں کہ امام خمینی نے جو ثقافتی انقلاب کی بات کو کہی ہے آخر اس کا راز کیا ہے؟ کیونکہ اس سے پہلے بھی ثقافتی انقلاب فرہنگی کی بات آئی تھی جو کہ چین کے ثقافتی انقلاب سے متعلّق تھی جسکی بنیاد" ماؤ" نے رکھی تھی بہر حال ساری دنیا سے اہل فکر ونظر اور سیاسی لوگ ایران آئے تا کہ دیکھیں امام خمینی کیا کرنا چاہتے ہیں مجھکو خود یاد ہے کہ ایک یہودی استاد بھی آسٹریلیا سے قم آیا تھا میں نے خود جلسہ میں بیٹھ کر اس سے بحث و گفتگو کی وہ جاننا چاہتا تھا کہ آخر امام خمینی کا تہذیبی انقلاب کیا ہے؟ میں نے اس کو وضاحت کے ساتھ بتایا۔

لیکن افسوس کہ ایسے حالات سامنے آئے کہ امام خمینی اپنے ارمان کو صحیح طریقے سے بیان نہ کر سکے اور اس کو عملی جامہ نہ پہنا سکے چونکہ نیا نیا انقلاب آیا تھا مختلف مسائل اور مشکلات سامنے تھے ابھی کچھ ہی دن گذرے تھے کہ آٹھ سالہ جنگ ہم پر مسلّط کر دی گئی جو کہ ملک کا سب سے اہم مسئلہ بن گئی ہم کو اس پر بہت ہی امکانات اور قوت و طاقت صرف کرنی پڑی، بہر حال ملک کے اندر اور باہر شیطان صفت افراد متحد ہو گئے یہ بھی ایک سبب بنا کہ جو ثقافتی انقلاب امام خمینی کے ذہن میں تھا وہ حقیقی اور عملی صورت اختیار نہیں کر سکا لہٰذا اگر کوئی یہ نتیجہ

نکالے کہ بیرونی دباؤ اورفوجی محاصرہ اور اقتصادی پابندی اور طرح طرح کی مشکلات ہمارے لئے کھڑی کی گئیں وہ سب صرف اس لئے کیا گیا کہ امام خمینی کا ثقافتی انقلاب کامیاب نہ ہو سکے اس جملہ میں کچھ نہ کچھ ربط ضرور ہے اور اس کو بعید از امکان نہیں سمجھنا چاہیئے، آپ خود بوسینا میں دیکھیں کہ وہاں اتنے ظلم کیوں کئے گئے؟ اور بہت ہی بے رحمی اور پوری دشمنی کے ساتھ ہزاروں مردوں، عورتوں، بوڑھوں جوانوں حتیٰ بچّوں کو قتل کر کے انکے سر کیوں جدا کئے گئے؟ اور جو لوگ حیوانات کی حفاظت کے لئے انجمن بناتے ہیں اور چند حیوانات کے لئے مظاہرہ کرتے ہیں وہ لوگ بھی انسانوں پر اتنے ظلم وستم کے بعد بیٹھے دیکھتے رہے اور انکی زبان پر ذلّت ورسوائی کا تالا پڑا رہا اور ان سے کچھ نہ بولا گیا بلکہ اس کے بر خلاف ظالموں کی مالی اور جنگی مدد بھی کرتے رہے، کیا اس کا سبب ثقافتی اور تہذیبی مسئلہ کے علاوہ کچھ اور تھا؟ کیا ان مسلمانوں کی تعداد دو تین ملین سے زیادہ تھی؟ یہ نہ زمین رکھتے تھے اور نہ مکان نہ انکی تعداد زیادہ تھی نہ ہی انکے پاس دولت، ہتھیار، ٹکنالوجی اور کوئی اہم چیز تھی تو ان لوگوں پر اتنا بھیانک حملہ اور ظلم وستم کیوں ہوا؟ اس کا جواب صرف ایک چیز ہے وہ یہ کہ ان کے پاس صرف ثقافت اور اسلام کا کلچر تھا وہ لوگ دیکھ رہے تھے کہ بیسویں صدی کے آخر میں یورپ کے مرکز میں ایک اسلامی ملک ظاہر ہو رہا ہے اور اپنے وجود کا برملا اعلان کر رہا ہے اس سے وہ لوگ خوف زدہ تھے کہ اسلامی فرہنگ اور کلچر دھیرے دھیرے پڑوسی ممالک اور پورے یورپ میں پھیل جائے گا اور آگے چل کر پورے یورپ میں ہر چیز کو بدل دے گا لہٰذا ان لوگوں نے ارادہ کیا کہ آغاز میں ہی اس تحریک کو ختم کر دیا جائے اور یہی کام الجزائر، ترکیہ

اور دوسرے اسلامی ممالک میں انجام دیا گیا، آخر کیوں ؟ یہ لوگ اسلام سے خوف زدہ ہیں اسلام کیا ہے؟ اسلام ایک فکر اور فرہنگ ثقافت کا نام ہے تو گویا یہ لوگ ایک فکر اور فرہنگ سے ڈرتے ہیں

اس طولانی مقدّمہ کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم کو اس سوال کے جواب میں کہ کیا کرنا چاہئے؟ صرف یہی ہے کہ ہم کو ثقافتی کام کرنا ہے یہ ساری بحثیں اس بات کا سبب بنتی ہیں کہ ہم زیادہ سے زیادہ اپنی ذمہ داری کو انجام دیں اور اس بات کو اپنے ذہن سے نکال دیں کہ یہ فکری اور فرہنگی بحثیں بے فائدہ ہیں اور ملک میں جو کچھ بھی مشکل ہے اسکا تعلّق صرف اقتصاد اور خارجی سیاست وغیرہ جیسے مسائل سے ہے۔

انقلاب کے ارتقاء میں ثقافتی تحریکوں کا کردار

اسلامی تہذیب وتمدن کو فروغ دینے کے لئے ہم کو اصول اور نظام کی ضرورت ہے ہم کو چاہئے کہ ہم اپنی تحریک کی راہ وروش کو معین کریں جو حالات ہمارے سامنے ہیں ان کو محسوس کریں اپنے طریقہ کار کو پہچانیں اسی طرح اس تحریک سے متعلّق راستے میں آنے والی رکاوٹوں کو دیکھیں اور ان سے متعلّق جو لازمی تدابیر ہیں انکو اختیار کریں، اس راستے میں سب سے پہلا قدم یہ ہونا چاہئے کہ ہم فکروں کو نئے انداز سے پیش کریں، اپنے مطالعہ کو وسیع اور مضبوط کریں ،فکروں کے اصول کو قائم کریں اصولی اور بنیادی طور پر محکم انداز سے اپنے کام کو شروع کریں۔

انقلاب کے شروع میں ہم لوگ ایک مختصر شناخت رکھتے تھے ہم کو ظالموں اور انکے پٹھوؤں کے مقابلے میں پوری طاقت کے ساتھ کھڑا ہونا چاہئے اسی مختصر شناخت پر ہم نے حرکت کی اور انقلاب اسلامی کامیاب ہوا اور یہاں تک پہونچا ہے آج بھی لوگوں کی اکثریت اسی اصول اور قانون کی پابند ہے لیکن ہم کو اس بات پر توجّہ دینی ہوگی کہ اس انقلاب کو باقی رکھنے اور اس کے تحفظ کے لئے یہ تھوڑی سی شناخت کافی نہیں ہے اس حرکت کے آغاز اور انقلاب کی کامیابی کے لئے زیادہ تر احساسات اور جذبات پر بھروسہ تھا جو کہ اسی مختصر شناخت کے ساتھ تھا جس سے کچھ نتیجہ حاصل ہوا لیکن اس راستے کو جاری رکھنے کے لئے صرف اس پر عمل کرنا کافی نہیں ہے بلکہ ہم کو اب اصل میں احساس وعواطف سے ہٹ کر شناخت اور بصیرت کے اسباب پر زیادہ توجّہ دینی ہوگی۔ اب آج نوحہ وماتم اور نعروں سے لوگوں کو جمع نہیں کیا جا سکتا البتہ یہ سب چیزیں اپنی جگہ پر باقی رہیں اور محفوظ رکھی جائیں، لیکن گفتگو اس بات میں ہے کہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ثقافتی امور اور تہذیبی مراکز میں کوئی رخنہ وارد نہ ہو اور ہم دشمن کے نفوذ سے محفوظ رہیں تو ہمیں چاہئے کہ ہم غور وفکر کے ساتھ فرہنگ وثقافت کی طرف خاص توجّہ دیں۔ آج دشمن بھی چالاکی کے ساتھ اس نکتے کو پہچان گیا ہے اس نے اپنی قوی اور مستحکم حرکت کو اقتصادی اور فوج میدان سے ہٹا کر سارے امکانات کو ثقافتی مسائل میں صرف کر رہا ہے اور دشمن اس کوشش میں ہے کہ اس طرح سے انقلاب کے ثقافتی مراکز کو آلودہ اور خراب کرکے دھیرے دھیرے تمام میدان کو اپنے قبضہ واختیار میں کر لے، اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس ثقافتی شگاف کو روکیں اور دشمن کو اس طرف سے داخل نہ ہونے دیں تو ہمیں

چاہئے کہ اس پراگندگی اور بے نظمی سے اپنے کو نکالیں، اگر ہم یونیورسٹی کے استاد کی حیثیت سے چاہتے ہیں کہ ثقافتی کاموں کو انجام دیں اور اسلام کی قدرو قیمت اور اسکی اہمیت کو نو جوانوں کے ذہن تک پہونچائیں تو سب سے پہلے ہم اپنے کو فکری اور ثقافتی اسلحہ سے لیس کریں اور اسلامی فکر و ثقافت اور اسکے مبانی و اصول نیز مغربی فکر و ثقافت اور وہ شبہات جو کہ وہ لوگ پیش کرتے ہیں اس کو جانیں اور پہچانیں تا کہ معاشرہ خاص طور سے نو جوان نسلوں کے مسائل اور مشکلات اور انکے فکری اور ثقافتی شبہات و مشکلات کو حل کر سکیں اور انکے سوالات کے جوابات دے سکیں البتہ خداوند عالم خود اپنے دین کا محافظ ہے قرآن کریم میں ارشاد ہورہا ہے:" انّا نحن نزّلنا الذکر وانّا لہ لحافظون" (۱) بیشک ہم نے قران کریم کو نازل کیا اور ہم ہی اسکے محافظ ہیں۔ اور بیشک خداوند عالم ان تمام ظلمتوں اور تاریکیوں کے باوجود اسلام اور دین کی کشتی کو ساحل نجات تک پہونچائے گا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے" ہوالذی ارسل رسولہ بالہدیٰ ودین الحق۔۔۔" (۲) وہ خدا ہے جس نے پیغمبر کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تا کہ اسکو تمام ادیان پر غالب کردے ہر چند کہ مشرکین اس بات کو نا پسند کریں ۔لیکن اس دین کی حفاظت کیوں نہ ہمارے ذریعہ ہو اور کیوں نہ ہم اس گروہ سے ہوں جن کو خداوند عالم نے کلمہ حق کی بلندی کے لئے اور اپنے دین کی حفاظت کے لئے چنا ہے۔؟

امید کرتا ہوں کہ خداوند عالم ہم سبھی لوگوں کو یہ توفیق عنایت فرمائے اور آخر میں اس بات کی تاکید کرتا ہوں کہ آج ہم لوگ اپنی حسّاس اور تاریخی ذمہ داری کو محسوس کریں اور اس ذمہ داری کو انجام دینے اور اپنی فکری اور فلسفی خامیوں کو دور کرنے کے لئے ضروری تیّاریاں

کریں اوراس بات پرتوّجہ دیں کہ اگرخدانخواستہ اس عظیم کام اوراس ذمہ داری کوانجام دینے میں کوئی کمی یا کوتاہی کی تو خداوندعالم، پیغمبراکرم، ائمہ معصومین علیہم السلام اوران شہداء کی بارگاہ میں جنھوں نے اپنا خون نچھاور کرکے اس پاک وپاکیزہ شجرکومحفوظ رکھا ہم لوگ اس کے جواب دہ ہونگے اورآسانی سے اس سے بچ نہیں سکتے۔

....

(۱)سورہ حجر: آیہ ۹۔

(۲)سورہ صف: آیہ ۹۔

تہذیب وثقافت کے سلسلے میں ہماری ذمہ داری (۲)

خداوندعالم کا شکرادا کرتے ہیں کہ اس نے توفیق عطا فرمائی کہ دوبارہ یونیورسٹی کے معظّم اساتید کے درمیان گفتگوکرنے کا موقع ملا اس کے پہلے جلسے میں گفتگواس بارے میں تھی کہ ہمارے اوپرکیا کیا ذمہ داریاں ہیں؟ اس کومیں نے کچھ حدتک بیان کیااوراس ضمن میں چند باتیں آپ کے سامنے پیش کیں اس جلسے میں میں نے بیان کیا تھا کہ تہذیب وثقافت سے متعلق امورکوانجام دینے کے لئے سب سے پہلے ہم کوکچھ بنیادی باتوں پرغوروفکرکرنی ہوگی منجملہ انکے موجودہ حالات کوجاننااورانکی تجزیہ اورتحلیل شامل ہے،اگرچہ ہم لوگ اجمالی اور مختصرطور پراپنے اندرایک ذمہ داری کومحسوس کرتے ہیں اوریہی احساس ہے جس نے ہم لوگوں کوایک جگہ جمع ہونے پرمجبورکیا ہے اورہم لوگ ایک اجتماعی تحریک کے لئے آمادہ ہیں

لیکن اس ذمہ داری کو زیادہ سے زیادہ سمجھنے اور بہتر طریقے سے جاننے کے لئے انقلاب اجتماعی اور سیاسی حالات اور اس کی گذشتہ تاریخ کو جاننا ضروری ہوگا تا کہ موجودہ حالات کی تصویر کو زیادہ واضح طریقے سے سمجھ سکیں اور زیادہ معلومات کے ساتھ مطلوبہ حالت کی طرف قدم بڑھا سکیں، البتہ اس بارے میں مزید تفصیلی بحث ہونی چاہیے لیکن وقت کی کمی اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ اس گفتگو کو زیادہ تفصیل کے ساتھ پیش کیا جائے مجبوراً اسی ایک جلسہ میں اس مسئلہ کو پیش کر کے ختم کیا جا رہا ہے۔

بہمن ۱۳۵۷ھجری شمشی سے پہلے ایران کی ایک تصویر

ہم سب کو معلوم ہے کہ اصل میں یہ تحریک، انقلاب اسلامی کی کامیابی سے پندرہ سال پہلے ٤٢ ہجری شمسی سے شروع ہو چکی تھی یہ پندرہ سال کا عرصہ ایرانی عوام پر بہت ہی سخت گذرا ہے افراتفری کی حالت پورے ملک میں پائی جاتی تھی۔ اقتصادی بحران، سرکاری خزانے کی غارت گری اور تمام شعبوں میں گمراہی جو دربار شاہ سے وابستہ تھے ان میں اخلاقی برائیاں نیز سرکاری ملازمین میں غلط کاریاں، بے انتہا رشوت خوری، ہر جگہ نا قابل برداشت طبقاتی اختلاف نیز اسکے علاوہ اور بہت ساری خرابیاں جس نے لوگوں کو عاجز کر دیا تھا اس کے علاوہ اجتماعی معاملات میں غیروں، خاص کر امریکا کا عمل دخل پوری طرح سے اتنا دکھائی دیتا تھا کہ بلند و بالا وزیر اور عہدہ دار بھی امریکی تسلّط کے زیر اثر تھے اور عملی طور سے امریکی سفارت خانہ تھا کہ جس کے ہاتھ میں ملک کی ساری حاکمیت تھی، وہ لوگ ہماری عوام حتّی بزرگ

شخصیتوں کی بے عزتی اورتوہین کیا کرتے تھے اور بار بار کی حقارت وتوہین سے ان لوگوں کے اندر بہت حدتک احساس کمتری پیدا ہوگیا تھا اورعوام یہ تصوّر کرنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ امریکی ہی متمدّن اور ترقی یافتہ ہیں اور ہم لوگ ان کے مقابلے میں بے حیثیت اور پس ماندہ ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ دوسرا سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ وہ لوگ دین سے مقابلہ ومبارزہ کی سیاست اپنائے ہوئے تھے اور یہ فکر دن بہ دن وسیع ہوتی جارہی تھی اور ایک مضبوط صدا بن رہی تھی آخری دنوں میں بات یہاں تک پہونچ گئی تھی کہ ان لوگوں نے درمیان سے سارے پردوں کوختم کردیا تھا وہ لوگ عام طور سے دینی مقدّسات سے کھلواڑ کر رہے تھے ان تمام حالات کے ہوتے ہوئے ایک عام اور وسیع انقلاب کا ہونا ناگزیر ہوگیا تھا

۔

شہنشاہی دور کی سب سے بڑی آفت

اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس وقت کے حالات کا تجزیہ کریں تو سب سے بڑی آفت میری نظر میں یہ تھی کہ پچھلی استعماری سیاست کے ذریعہ خاص طور سے پہلوی نظام کے پچاّس ساٹھ سالہ دور میں ان لوگوں نے جو کام کیا وہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے گروہ اور دیندار افراد کو سیاست سے بالکل خارج کر دیا تھا،اس زمانے کی بہت سی چیزیں مجھکو یاد ہیں لیکن جس نکتہ کی طرف میں نے اشارہ کیا اس کی طرف بہت کم دوستوں کی توّجہ ہوگی یا انکو یاد نہ ہوگا،یہ ایک بلا تھی اور بہت ہی اہم مسئلہ تھا جو ان لوگوں نے اس ملّت کے لئے ایجاد کر دیا تھا۔اس طرح کی ان

لوگوں نے سیاست گذاری کی تھی کہ اس ملک کے سیاسی اور اجتماعی کاموں کو کچھ ایسے افراد کے حوالے کر دیا تھا کہ جو ان کے مطابق تھے ایسے منتخب افراد کہ جن میں اسّی فیصد سے زیادہ امریکہ میں تعلیم حاصل کئے ہوئے تھے یا ایران میں ایسی یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ تھے جو امریکہ کے زیر اثر تھیں منجملہ ان یونیورسٹیوں میں تہران کا " دانشکدۂ مدیریت" (جو آجکل امام صادق یونیورسٹی) اور شیراز کی یونیورسٹی تھی شیراز کی یونیورسٹی کا جو مالک ہوتا تھا وہ سفارت امریکہ سے معیّن ہوتا تھا اور دوسری یونیورسٹیوں کے نظام اور نصاب بھی امریکی ہی معیّن کرتے تھے، بہر حال ملک کی سیاست گذاری عملی طور سے انھیں منتخب اور چنندہ دانشوروں کے ہاتھ میں تھی جنکی اکثریت امریکہ کی تربیت یافتہ تھی، البتہ یہ سیاست اصل میں انگریزوں کی ہے جو بہت ہی باضابطہ اور منظّم انداز میں تھی، امریکہ نے سیاست کے اس طریقے کو انگریزوں سے سیکھا ہے تاکہ اس ذریعہ سے ان ممالک میں بہت دنوں تک اپنا تسلّط برقرار رکھ سکیں لہٰذا وہ اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ ایسے دانشوروں کی خود انھیں ملک میں تربیت کریں جو بلا واسطہ طریقے سے انکی فکروں کو پروان چڑھائے اور وہ ان کے مطابق ہر کام کرنے کے لئے تیار ہوں۔ اس سیاست کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملک کے عام مسلمانوں کا ملک کی سیاست اور سرکاری امور میں کوئی کردار نظر نہیں آرہا تھا صرف ایک پارلیمنٹ تھی جہاں عوام کی کسی حد تک دخالت نظر آرہی تھی وہ بھی اس طرح کہ ممبروں کی ایک لیسٹ اور فہرست دربار شاہ اور امریکی سفارت خانہ کے توسط سے پہلے ہی معیّن ہو جاتی تھی اور وہی نام انتخابات کے دن بکسوں سے باہر آتے تھے۔

اگر چہ ملک کے دانشوروں میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو ملک کی موجودہ سیاست سے متّفق نہیں تھے اور کسی بھی طرح ان کے ساتھ رہنے کو آمادہ نہیں تھے بلکہ ان سے مقابلہ کے لئے تیّار تھے اس سلسلے میں ان لوگوں نے کئی جماعتیں تشکیل دی تھیں ان میں سے ایک حزب تودہ (تودہ پارٹی) تھی اگر چہ یہ لوگ بھی کسی حد تک مشرقی استعمار کا آلہ کار تھے اور کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو روس کی طرف جھکاؤ رکھتے تھے اور وہ لوگ چاہتے تھے کہ ایران ایک سو سلشٹ اور روسی فکر میں تبدیل ہو جائے ،بہر حال پھر بھی اس گروہ میں کچھ مخلص اور سچّے لوگ بھی پائے جاتے تھے جو حقیقت میں انگریزوں اور امریکہ کے تسلّط اور استعمار کے چنگل سے بچنے کے لئے اسکے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں سمجھتے تھے تا کہ اپنے کو روسیوں کے حوالہ کر دیں یعنی انکے ذہن میں یہ بات ڈال دی گئی تھی کہ تیسری دنیا کے مما لک مثلاً ایران وغیرہ کے سامنے صرف دو ہی راستہ ہے یا وہ امریکی پرچم کے نیچے آجائیں یا روسی پرچم کے زیر سایہ تا کہ انکے لئے دوسرے لوگوں سے مقابلہ کرنا ممکن اور آسان ہو جائے اگر چہ یہ دوسرے گروہ والے زیادہ نہیں تھے لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ اس خیال کے حامی ضرور تھے بہر حال ان دنوں دانشوروں کی ایک جماعت حزب تودہ کی شکل میں جمع ہو گئی تھی اور رسمی کاموں کو انجام دیتی تھی آج بھی ہم کو اس طرح کی تنظیم سے غافل نہیں ہونا چاہئے چونکہ یہ لوگ دوبارہ موقع کو غنیمت جان کر چوری چھپے اپنے کو پھر سے آمادہ کر رہے ہیں ۔اور اس بائیں بازو میں تودہ پارٹی کے علاوہ دوسرے گروہ جیسے فدائی خلق ،کارگر پارٹی ،رنتگار پارٹی ،اور مختلف قسم کے مقامی گروہ مختلف علاقوں جیسے کردستان ، آذربائیجان ، ترکمنستان اور خوزستان وغیرہ میں

موجود تھے ان تمام پارٹیوں کا مارکس ازم کی طرف جھکاؤ تھا۔اس بات کا تذکرہ مناسب ہے کہ بہت سے گروہ جو کسی نام سے پائے جاتے تھے حقیقت میں اس کے اندر ممبران کی تعداد دس بیس افراد سے زیادہ نہیں تھی۔ ان بائیں بازو کی پارٹیوں کے مقابلہ میں اور دوسری پارٹیاں بھی پائی جاتی تھیں جن کا شمار داہنے بازو کی پارٹیوں میں ہوتا تھا جو کہ حکومت کی طرفدار اور اس پہلوی نظام کی موافق تھیں کہ مغربی بلاک سے تعلق رکھتی تھیں۔

اس درمیان جس بات کی کمی تھی وہ دیندار افراد کی فعّالیت اور ان کا متحرک نہ ہونا تھا مختلف چالوں اور حربوں سے ان لوگوں کو سیاست کے میدان سے جدا کر دیا گیا تھا اور اس طرح سے تبلیغ کی گئی تھی کہ اصلاً کوئی دیندار اور متدیّن سیاسی امور میں دخالت نہیں کرتا تھا۔

یہ بات مجھکو خود یاد ہے کہ جب کسی موقع پر کسی عالم دین کو بدنام کرنا چاہتے تھے تو کہتے تھے کہ یہ ملّا سیاسی ہے گویا ایسا دور آ گیا تھا کہ سیاسی مولوی ہونا ایک گالی تصوّر کیا جاتا تھا اسی وجہ سے دیندار افراد خاص طور سے عالم دین حضرات سیاست کے میدان میں اترنے سے پرہیز کرتے تھے۔ یہاں تک کہ آہستہ آہستہ بعض اسلامی ممالک کی پیروی اور کچھ دوسرے اسباب کی بنا پر دینداروں کے درمیان بھی بعض سیاسی گروہ پیدا ہو گئے تھے مشہور تنظیم" فدائیان خلق" انھیں گروہوں میں سے ایک تھی اگر چہ یہ ایک چھوٹی سی تنظیم تھی لیکن اپنی جگہ بہت ہی مصمّم اور مستحکم پارٹی تھی، ایک دوسرا گروہ" حزب ملل اسلامی" تھا جو کہ ۲۸ مرداد کے بعد عالم وجود میں آیا تھا یہ لوگ بھی معدودے چند افراد سے زیادہ نہیں تھے اور آخر کار گوشۂ گمنامی میں چلے گئے اسی دوران (جو کہ مرحوم آیت۔۔کاشانی کے سیاسی کارناموں

کی بلندی کا دور تھا) ایک دوسرا گروہ "مجاہدین اسلام" بھی تھا جس کے بانی شمس قنات آبادی تھے" سازمان مجاہدین خلق" جس کو آجکل ہم گروہ منافقین کے نام سے جانتے ہیں حقیقت میں اسی گروہ کا ایک حصّہ تھا جس کے بانی یہی شمس تھے جیسا کہ آپ جانتے ہیں بعد میں چل کر اس گروہ نے مارکسی رجحان پیدا کر لیا اور آخر کار امریکہ اور مغرب کے دامن میں چلا گیا بہرحال ملک کے سیاسی حالات کی یہ تصویر اور یہ متحّرک تنظیمیں انقلاب کی کامیابی سے پہلے تھیں جو انھیں مذکورہ چند گروہوں میں منحصر تھیں اور ملک کے مخلص اور معتقد مسلمانوں کی اکثریت، جو کہ نوّے فیصد تھے اس میدان سے پوری طرح دور تھے سیاست میں آنے کے لئے انکے پاس کوئی ذریعہ اور راستہ نہیں تھا ان نوّے فیصد لوگوں میں حالات اور واقعات کی حقیقت سے آگاہی رکھنے والے افراد کم نہ تھے یہ لوگ حقیقت میں ملک کے حالات سے ناراض تھے اور خون دل پیتے تھے لیکن عملی طور سے کچھ نہیں کر سکتے تھے انکو کچھ امید بھی نہیں تھی اس زمانے میں چند اسلامی گروہوں کے درمیان جو کہ واقعاً اسلام سے لگاؤ رکھتے تھے اور وہ شاہ کی حکومت کو قبول نہیں کرتے تھے نیز بائیں بازو اور مارکس ازم کی طرف بھی ان کا رجحان نہیں تھا ایک گروہ "نہضت آزادی" بھی تھا اس گروہ میں چند نوجوان لڑکے تھے جنھوں نے اکٹھا ہو کر ایک تنظیم بنالی تھی اور دھیرے دھیرے اس تنظیم نے تحریک آزادی کی شکل اختیار کر لی تھی اس تنظیم کی بنیاد ڈالنے والے لوگوں میں انجینئر بازرگان اور ڈاکٹر یدا... سحابی کا نام لیا جاسکتا ہے، تہران یونیورسٹی کے شعبہ فنّی کی مسجد کی بنیاد ڈالنے والے یہی مہندس بازرگان تھے، اسی طرح آپ کئی رسالوں کو مختلف شکل میں چھاپتے تھے ان میں ایک

رسالہ" گنج شایگاں" تھا،تحریک آزادی والے بھی مجاہدین خلق کی طرح اسلام سے ربط رکھتے تھےنمازی اورروزہ دار بلکہ بعض عابدشب زندہ دار بھی تھے،اگرچہ تحریک آزادی والے بھی مجاہدین خلق کی طرح راستے سے بھٹک گئے اورخودکو سیاسی حیثیت سے محفوظ رکھنے کے لئے محاذملّی کےان ممبران کےعنوان سے پیش کیا جوکہ سیاسی دانشوروں کےدرمیان دوسروں سے بہترتصوّرکئے جاتے تھے،اورویسا ہی کام کرنے لگےسیاسی اعتبار سے ملک کی یہ حالت اس وقت،انقلاب کی کامیابی سے پہلے تھی۔

سیاسی تغیّراورانقلاب کے لئے امام خمینی کی حکمت عملی

ان حالات میں امام خمینی نےفہم وفراست اورسیاسی بصیرت کےساتھ جوکہ شروع سے آپ رکھتے تھے یہ محسوس کیا کہ یہ سیاسی کارنامے جودانشوروں کےمختلف گروہوں کی طرف سے انجام دیئے جارہے ہیں اگرنتیجہ کو پہونچ جائیں توبھی اس سے اسلام کوکوئی فائدہ پہونچنے والا نہیں ہے حتّیٰ جولوگ اسلام کے نام پر جوکچھ کررہے ہیں اس سے بھی کچھ فائدہ ہونے والانہیں ہے،صرف ایک راستہ جوامام خمینی کی نظر میں فائدہ مند تھااوراس کا ہوناضروری تھاوہ یہ کہ عام مسلمانوں کومیدان میں لایا جائے امام خمینی کا یہ عقیدہ تھا کہ یہ جماعتیں اور تنظیمیں ایک اسلامی انقلاب(جوکہ مضبوطی کےساتھ تمام شعبوں میں حاکم ہواورحکومت اسلامی کی شکل میں ہو)نہیں لاسکتی ہیں،اگرچہ امام خمینی کی تھیوری اس زمانے میں قابل قبول نہیں تھی اورآج بھی نہیں ہے وہ لوگ اس بات کے معتقد تھے کہ جہاں بھی جس صورت میں سیاسی

تحریک اور فعّالیت انجام پائے، اس کا نتیجہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ کسی گروہ یا تنظیم کی شکل میں کسی خاص رابطہ اور قاعدہ کے ساتھ انجام پائے اسکے برخلاف ایسی تحریک جو عمومی طور سے ہو اور اس میں سب کے سب لوگ دخالت رکھتے ہوں اور سب کے سب اپنے کو ذمہ دار محسوس کرتے ہوں اور وہ تمام لوگ متحد ہو کر حرکت کرتے ہوں تو علوم سیاسی کے کلاسکی نظریات میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اگر امام خمینی یہ چاہتے کہ اپنے نظریات اور افکار کو علمی نظریہ کی شکل میں پیش کریں اور اس کے بارے میں بحث و گفتگو کریں تو کوئی بھی اس کو قبول نہیں کرتا امام خمینی نے اس سیاسی مطلب کو علمی نظریہ میں پیش کرنے کے بجائے اس کام کو عملی طور سے پیش کرنا شروع کیا اور آپ نے مصمّم ارادہ کرلیا کہ عام لوگوں کو میدان میں لیکر آئیں اور اس احساس ذمہ دارری کو عام لوگوں کے ذہن میں ڈال دیا کہ مسلمان ہونے کے ناطے تمام لوگوں کا یہ فریضہ بنتا ہے کہ وہ ملک کے سیاسی امور میں حصّہ لیں، امام خمینی کی یہ فکر دوسری اور فکروں کی طرح ایک نئ فکر تھی اگر امام خمینی س راستے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ اختیار کرتے تو کوئی خاطر خواہ انقلاب پیدانہیں کر سکتے تھے امام خمینی نے عوامی طاقت اوران کی حمایت سے اتنی بڑی کامیابی حاصل کر لی اور اس تحریک کو جو کہ اس کے پہلے ہمیں نظر نہیں آتی تھی وجود بخشا، اس کام کو کوئی بھی سیاسی گروہ چاہے بائیں بازو کی پارٹی ہو یا تنظیم ملّی ہو یا کوئی اور مذہبی گروہ ہو انجام دینے پر قادر نہیں تھا، اس بات کا دوست دشمن سب نے اعتراف کیا ہے۔ یہ صرف امام خمینی کی ذات تھی جس نے عظیم ملّت کے گروہوں میں چھپی ہوئی طاقت کو مشخّص کر کے ان کے دینی اور اسلامی جذبات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے نتیجہ خیز کام کو شروع کیا

۔ہم کو یہ بات اچھی طرح یاد ہے اور میں خود اس بات کا قریب سے گواہ ہوں کہ وہ آوارہ اور بیکار جوان جو کہ سڑکوں اور گلیوں میں پھرا کرتے تھے امام خمینی نے ان کو ایسا بدل دیا اور ایسا بنا دیا کہ وہ انقلاب کے وقت دشمنوں کے مقابلہ میں اپنے سینوں کو ڈھال بنا کر پیش کرتے تھے اور حکومت شاہ کے سپاہیوں سے کہتے تھے مارو جتنا مارنا ہے مارلو! امام خمینی نے لوگوں کے اندر ان کی دینی ذمہ داری کے احساس کو زندہ کر دیا آپ نے اپنی خالص نیّت سے ایسا کام کر دیا جس سے لوگوں میں محدود اور خشک گروہی رابطوں کے بجائے ایک گہرا اور صمیمانہ رابطہ پیدا ہوگیا لوگ امام خمینی سے محبّت کرتے تھے اور پروانہ کی طرح ارد گرد گھومتے تھے۔ یہ امام خمینی کی بے مثل اور بے نظیر رہبری اور قیادت تھی ہم آج بھی محبّت کے اس گہرے رشتے کو دیکھ رہے ہیں یہاں تک کہ آپکے انتقال کے سالوں بعد بھی آپ کا نام خاص احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔

بہر حال امام خمینی کی یہ تحریک اس روز کے رائج فارمولے اور سیاست سے جدا تھی، اس وقت جب ۱۳۵٦ ہجری شمسی میں لوگوں نے سڑکوں پر مظاہرہ شروع کیا تو اچھے اچھے لوگوں نے بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ بیس سال سے کم کی مدّت میں اس حرکت اور قیام کا کوئی نتیجہ نکل سکتا ہے اور کامیابی حاصل ہوگی ایسے افراد سے میری مراد ڈاکٹر بہشتی وغیرہ جیسے لوگ ہیں یہ لوگ کوئی معمولی شخصیت کے مالک نہیں تھے بلکہ بلند سیاسی درجہ رکھتے تھے ان جیسے لوگوں کا بھی (انقلاب اسلامی کی کامیابی سے پہلے اور آزادی کے آخری دنوں میں) یہی نظریہ تھا کہ ابھی بیس سال اور انتظار کریں لیکن سبھی لوگوں نے دیکھا کہ امام خمینیکی تحریک نے ایک سال اور

چند دنوں میں ہی نتیجہ دینا شروع کر دیا اور انقلاب کامیاب ہو گیا، ایسی چیز جس پر میں خود ذاتی طور پر بھی یقین نہیں کرتا تھا اگر کوئی کہتا تھا تو مجھے خواب و خیال سا لگتا تھا میں تو ایک معمولی آدمی ہوں مجھ سے بڑے بڑے لوگوں کا بھی تصّور اور خیال یہی تھا، بہر حال اگر یہ کہیں کہ ۱۳۵۷ میں انقلاب اسلامی ایران کی کامیابی ایک خدائی معجزہ تھی تو میرے نزدیک یہ کوئی مبالغہ کی بات نہیں ہوگی۔

انقلاب کی کامیابی کے بعد بعض ایسے مفسد گروہ کہ جنکی لوگوں کے درمیان کوئی وقعت نہیں تھی اوران کی بیہودہ حرکتیں، فریب کاریاں اور قتل و غارت گری ہی خود ان کے خاتمہ کا سبب بنی اور وہ ملک سے بھاگ گئے ان کے علاوہ کچھ دوسرے گروہ باقی رہ گئے جیسے تودہ پارٹی، دہشت گرد فدائی خلق، پان ایرانیسٹ، محاذ ملّی اور تحریک آزادی یہ لوگ پہلے کی طرح کام کرتے رہے انکے لئے کوئی چیز مانع بھی نہیں تھی اور انکے جان و مال محفوظ تھے۔

یہاں تک تقریباً وہ مطالب تھے جن کو آپ سبھی لوگ جانتے تھے اور کوئی نئی بات نہیں تھی صرف ان مسائل اور واقعات پر جو انقلاب کی کامیابی سے پہلے تھے ایک سرسری نظر ڈالی گئی اور اکثر مطالب مقدّمہ کے عنوان سے تھے اصل بحث جس پر میری خاص تاکید ہے اس کے بعد ہے جس پر میں چاہتا ہوں کہ آپ خاص توجّہ دیں۔

حقیقی اسلام کے افکار و اقدار سے متعلق اسلامی نظام کے ذمہ داروں کا اعتقاد

انقلاب اسلامی کی کامیابی کے بعد طبعی طور سے ملک کی سرپرستی اور حکومت بنانے سے متعلق بحث ہوئی؛ سب سے پہلی حکومت انجینئر بازرگان کی صدارت میں بنی؛ اسکے بعد بہت سے حکومتیں کئی لوگوں کی سربراہی میں بنیں؛ بہت سی کمیاں اور فطری اشکالات جو کم تجربگی اور نئے ہونے کی وجہ سے لازمی تھے وہ سب پائے جاتے تھے جیسا کہ ہر انقلاب اور ہر نئی حکومت کی خصوصیت ہے لیکن اس کے علاوہ اس جگہ جو چیز قابل سوال ہے وہ یہ کہ کیا ارکان حکومت کے تمام لوگ امام خمینیکی طرح فکر رکھتے تھے اور کیا سبھی لوگ معاشرہ میں دین کے اثر کے متعلق وہی چیز سمجھتے تھے جو مرحوم امام سمجھتے تھے۔

اس وقت ملک کے بڑے لوگ جن کا شمار سیاسی طور پر بزرگوں اور فیصلہ کن لوگوں میں ہوتا تھا جیسے شہید بہشتی؛ شہید مطہری؛ شہد باہنر اور ان جیسے دوسرے لوگ جو سالوں امام خمینیکے زیر سایہ تربیت پا چکے تھے یہ لوگ مکمل طور سے امام خمینیکی فکروں اور نظریوں سے واقف تھے اس کے علاوہ یہ لوگ خود بھی اچھّی صلاحیت کے مالک تھے اسلام کے معارف اور اصول کا وسیع اور گہرا مطالعہ رکھتے تھے اور اسلام کے اصول و احکام اور معارف کا بخوبی علم رکھتے تھے، ایسے لوگ امام خمینیکے راستوں کو پہچانتے تھے اور اس پر اعتماد اور یقین رکھتے تھے اور حقیقت میں وہی چاہتے تھے جس کی فکر اور جستجو میں امام خمینی تھے؛ لیکن ذرا آپ غور کریں یہ لوگ کتنے سال زندہ رہے؟ انقلاب کے ایک دوسال کے شروع میں ہی اکثر کو شہید کر دیا گیا سب سے

پہلے مرتضیٰ مطہری کوشہید کیا گیا اس کے بعد ۷ تیر اور ۸ شہر یور کا واقعہ ہوا؛جس میں بہشتی؛ باہنر وغیرہ شہید ہو گئے نیز اور دوسرے بہت سارے واقعات جس میں بہت سے ایسے لوگ جو امام خمینیکے افکار اور اصول سے اچھی طرح واقف تھے اور اسی اصول پر یقین رکھتے تھے ملک کے سیاسی عہدوں پر متمکّن تھے اور ملک کے قوانین بنانے میں اہم رول رکھتے تھے وہ لوگ ہمارے درمیان سے رخصت ہو گئے، دشمن جو کہ سارے حالات سے باخبر تھا اس سے پہلے کہ ہم ان شخصیات کو اچھی طرح پہچانیں اس نے ان تمام لوگوں کو ہم سے چھین لیا؛ وہ بعض افراد کہ جن کا نام ہم نے لیا اور دوسرے چند لوگوں کو چھوڑ کر وہ تمام لوگ جو کہ ۸ شہر یور کے واقعہ اور مرحوم باہنر کی حکومت کے بعد حکومت کے لئے آئے اور ملک کے اہم سرکاری عہدوں اور وزارتوں پر فائز ہوئے وہ لوگ نہ اس حد تک امام خمینیکو پہچانتے تھے اور نہ انکی روحی اور معنوی نظر اس قابل تھی کہ وہ امام خمینی کے افکار کو پہچان سکیں؛ مختلف لوگ کم وبیش مغربی ثقافت اور تعلیمات سے متاثر تھے وہ لوگ اسلامی معارف وثقافت سے دور تھے یہ فاصلہ دن بہ دن ہر حکومت میں پچھلی حکومت اور اس کے مسئولین کی نسبت بڑھتا چلا گیا ؛لیکن جب تک امام خمینی زندہ تھے آپ کی روحانی عظمت اور الٰہی ومعنوی شخصیت جس کا سایہ سارے ملک پر تھا بہت کم لوگ اپنی دلی خواہش کا اظہار کرتے تھے حتیٰ جو لوگ امام خمینیکی فکروں اور اصول کی مخالفت کرتے تھے وہ لوگ بھی مخالفت کے لئے راستے کو ہموار نہیں دیکھتے تھے اور پھر وہ عملی طور سے کوئی بات پیش نہیں کر سکتے تھے۔ بہر حال امام خمینیکے انتقال کے بعد آپ کے راستے اور افکار سے دوری کا راستہ ہموار ہوتا چلا گیا کیونکہ اب وہ مربی نہیں

رہا اور وہ معنوی شخصیت ہمارے درمیان نہیں رہی ؛امام خمینیایسی شخصیت تھے جنھوں نے ۸۰ سال تک سیاسی اور اجتماعی تلخ وشیریں حادثوں کوملاحظہ کیا نفسانی اورروحانی طور سے اپنے کوآمادہ کیااورآپ دشمن سے مقابلہ کا ۳۰ سالہ گرانبہا تجربہ رکھتے تھےلہٰذاامام خمینی کے بعد کوئی کتنی ہی خودسازی کرےاورکتنا ہی باتجربہاور بالائق ہووہ امام خمینیجیسا نہیں ہوسکتا، یہ خود ایک وجہ ہے جو دوسری مختلف وجھوں کے ساتھ فطری طور سے موجود ہے اوراس وقت ان کے بیان کی گنجائش نہیں ہیاور یہ سب وجہیں ایک ساتھ مل کراس بات کا سبب بن گئی ہیں کہ اسلامی افکارواقداردن بہ دن کم سے کمتر ہوتے جارہے ہیں اس وقت ہم یہ ذمہ داری رکھتے ہیں کہ حالات کوسمجھیں اورمناسب طریقہ کاراورحکمت عملی کے ذریعہ اس چیزکوآگے بڑھنے سے روکیں۔

اسلامی اقدار کو کم کرنے کے لئے اسلام دشمنوں کا منصوبہ

وہ عوامل اوراسباب جو ان باتوں کی حقیقت و ماہیت سے مربوط ہیں ان کے علاوہ بیرونی عوامل واسباب بھی اسلامی رنگ کو پھیکا کرنے کے لئے موثر اوراہم ہیں؛ انقلاب کےابتدائی دنوں میں امریکہ اور دوسرے مشرقی اور مغربی ممالک، نے یہ سوچا تھا کہ یہ انقلاب بھی دوسرے دنیاوی انقلابوں کی طرح اپنے زمانے پر کچھ اثر نہیں ڈال پائے گااورپھیل نہیں سکے گا؛لیکن آج بیس سال سے زیادہ کا عرصہ گذرگیادنیامیں کتنے تغیرات ہوئے ان لوگوں نے

یقین کرلیا کہ اسلام ایک بہترین اور ترقی دینے والا، لوگوں کی زندگیاں بنانے، دنیا کو چلانے اور معاشرہ کو بلندیوں کی طرف لے جانے کے لئے طاقت وقوت رکھتا ہے؛ آج ان لوگوں نے اس خطرہ کو پوری طرح سے محسوس کرلیا ہے اور اس کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے اسی وجہ سے عظیم سرمایہ اور وسیع پروگرام کے ساتھ اس تحریک کے مقابلہ کے لئے تیار ہو گئے ہیں اور اس کے اثرات کو ختم کرنے کے لئے ہر طرح سے آمادہ ہو گئے ہیں اور اس کے مٹانے کے درپے ہو گئے ہیں۔ آج دشمن کے تجزیہ کاروں نے ہمارے انقلاب کی قوتوں، کمزوریوں اور ان کے شگاف کو پہچان لیا ہے جن کے ذریعہ وہ اس محکم قلعہ میں نفوذ کرسکتا ہے اور ایسے پلان اور کارناموں کے ساتھ جن کو ہم تصور بھی نہیں کر سکتے انقلاب کی بنیادوں کو کمزور کرنے میں لگا ہوا ہے۔ البتہ بعض باتوں اور ان سے متعلق پلانوں کا ظاہر ہونا مشکل بھی نہیں ہے ایک معمولی تجزیے اور تجربے سے مشخّص کیا جا سکتا ہے کہ انسان کی حرکتوں اور افعال کے اصلی عنصر اور قلب کو دو چیزوں سے یعنی اسکی شناخت ومعرفت اور اس کے یقین واعتقاد سے معلوم کیا جا سکتا ہے لہٰذا جب بھی کسی انسان کے بارے میں ارادہ ہو کہ اس کی حرکت اور رفتار کو بدلیں تو فقط اس کی شناخت اور اس کے اعتقاد کا جائزہ لیں؛ اسی وجہ سے اسلام اور اس ملّت کے دشمنوں نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ ایک طرف لوگوں کے اعتقادات دینی کو کمزور کریں اور دوسری طرف اس بات میں لگے ہوئے ہیں کہ مادّی اور مغربی چیزوں کی اہمیت کو دینی اہمیت کی جگہ پیش کریں اور لوگوں کے اعتقاد کو بدل دیں؛ یہ حکمت عملی یعنی لوگوں کے اعتقاد ومعرفت کو بدلنے کی کوشش خاص طور سے نوجوان نسلوں میں بہت ہی موثر ہے کیونکہ یہ نسل

اعتقادی اور فکری اصول میں اتنی محکم اور مضبوط نہیں ہوئی ہے، زیادہ تر سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر استوار ہے اور سرسری طور سے صرف چند مسائل کو جانتی ہے اور ان پر اعتقاد رکھتی ہے ان کے پاس محکم تحقیقی اور استدلالی چیزیں نہیں ہیں، اعتقادات کے اعتبار سے بھی جوانی کی عمر خاص خواہشیں رکھتی ہیں یہ انسانی زندگی کا بہت ہی بحرانی مرحلہ ہوتا ہے جب مختلف طرح کا انسانی جسم میں خواہشوں کا طوفان ہوتا ہے، فطری طور سے نوجوان اپنی زندگی کی ظاہری اور مادی چیزوں کی طرف زیادہ توجہ دیتا ہے۔

البتہ مغربی حکومتیں یہ حکمت عملی صرف مسلمان ملت وقوم اور تیسری دنیا کے لوگوں کے لئے استعمال نہیں کرتی بلکہ یہ حکمت عملی اپنے ملک کے افراد کے لئے بھی استعمال کرتی ہیں وہ مغرب کے اکثر جوانوں کو سیکس، جنسی مسائل، الکحل، شراب اور بیگ جوتے چپّل، لباس، چہرہ اور بال وغیرہ کے ماڈلوں میں لگا دیتے ہیں اور ان چیزوں کو نئے نئے انداز سے پیش کرتے ہیں نیز کھیل کود سینما، اسباب آرائش اور اسی طرح کے دوسرے لوازمات میں مشغول رکھتے ہیں، ان لوگوں میں فقط کچھ لوگ ایسے ہیں جو کہ اچھی صلاحیت رکھتے ہیں یہ لوگ ان کی تشخیص کرتے ہیں اور ان کو علمی و تحقیقی شعبوں میں لگا دیتے ہیں اور ان پر سرمایہ خرچ کرتے ہیں ان کے خیالات اور تفکّرات سے نئی چیزوں کی ایجادات میں (جو کہ مختلف میدانوں میں ترقی کا ذریعہ ہیں) استفادہ کرتے ہیں۔

لہٰذا جس ملک کا اساسی قانون اسلام کے فرامین پر استوار ہو اور اس میں اصل محور ولایت فقیہ ہو اور وہاں پر اسلامی اقتدار حاکم ہو اور اس ملک کا سربراہ فقیہ، اسلام کو پہچاننے اور اس کے

احکام کو جاننے والا، تقویٰ کے عظیم مرتبہ پر فائز اور الٰہی اقدار اور انسانی کا حامل ہو، وہاں پر کیا کرنا چاہیئے کہ دشمن اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہوں؛ اس کا واضح سا جواب ہے کہ مختلف ثقافتی طریقوں جیسے کلاس، مدرسہ، یونیورسٹی، اخبارات و مطبوعات، فلم، سینما، ریڈیو، کتاب، کھیل کود اور ان جیسی دوسری چیزوں کے ذریعہ وارد ہونا چاہیئے اور یہ روش اور طریقے انسان کی شناخت اور اس کے اعتقاد کو پوری طرح سے بدل دیتے ہیں اور حقیقت میں اس سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ شاید آپ کے ذہن میں وہ ریڈیوئی گفتگو ہو گی کہ جس وقت کسی نامہ نگار نے ایک عورت سے سوال کیا کہ تمھارا آئیڈیل کون ہے تو اس نے جواب دیا کہ "اوشین" مرحوم امام خمینیؒ نے فوراً ریڈیو اسٹیشن کو ٹیلی فون کیا اور اس ریکارڈنگ کے نشر ہونے پر اعتراض کیا اور کہا کہ یہ عورت مرتد ہونے والی ہے آپ خود ہی غور کریں اور دیکھیں کہ علی اور فاطمہ زہرا صلوات اللہ علیہما کے ملک میں خود امام خمینیؒ کی زندگی میں کیا یہ ممکن ہے کہ ایک شیعہ عورت کا آئیڈیل اور نمونہ زینب و زہرا علیہما السلام نہیں بلکہ اوشین ہو سب سے اہم وہی پہلا قدم ہے اگر معرفت اور اعتقاد کی دیوار ٹوٹ گئی تو دشمن کے لئے پھر پورا راستہ آسان ہو جائیگا۔

قانون اور اجراء قانون کے شعبے میں دشمن کی دخل اندازی

دشمن کا دوسرا سب سے اہم پلان لوگوں کے اعتقادات اور یقین کو کمزور کرنے کے لئے یہ ہے کہ ملک کی سیاست کے شعبہ میں دخل اندازی کی جائے ایسے لوگوں کو حکومت اور عہدوں پر

لایا جائے جن کے اعتقاد اور فکری اصول اور خیالات کچھ حد تک امام سے دور ہوں اور ان کے تفکرّات مغربی فرہنگ وتہذیب سے متاثر ہوں؛ اس لئے کہ دیوار کو توڑیں کچھ اخبارات میں باواسطہ یا بلا واسطہ اپنا اثر ورسوخ جماتے ہیں اور پھر اسلام پر حملہ شروع کرتے ہیں اور اسلامی قوانین کو زیر سوال لاتے ہیں اور مقدّسات کی توہین کرتے ہیں جو لوگ اسلام کا اعتقاد رکھتے ہیں اور اسلامی اقدار کے پیرو اور طرف دار ہیں ان کی شخصیتوں کو مخدوش اور مجروح کرتے ہیں اور اسلامی و دینی اقدار پر تاکید کے بجائے نیشنلزم اور قومی اقدار کو پیش کرتے ہیں اور اس کی تبلیغ کرتے پھرتے ہیں اس کے علاوہ اور دسیوں باتیں ہیں جن کا ہم آج مشاہدہ کرتے ہیں، دشمن دھیرے دھیرے تمام شعبوں میں آگے اپنا قدم بڑھا رہا ہے ایسا نہیں ہے کہ یکبارگی شروع ہی میں وہ اپنا مدّعا اور ہدف بیان کردے گا اور اپنے مطالب کو پہلی ہی مرحلے میں پایہ تکمیل تک پہونچا دے گا۔

لیکن اگر اخبار والے چاہیں کہ ان تمام باتوں کو لکھیں تو ان کے سامنے قانونی مشکل ہے لہٰذا وہ قانونی مشکل کو حل کرنے کے لئے اور مطبوعات کی آزادی کے لئے قانون بدلنا چاہتے ہیں قانون بدلنے کے لئے پہلا قدم یہ ہے کہ ان کے بقول اعتدال پسند حکومت وجود میں آئے، ابتدا ہی میں یہ ممکن نہیں ہے کہ اسلام کے مقابلہ میں بے اسلامی کا نعرہ لگائیں؛ بلکہ ایسے لوگوں کو تلاش کرتے ہیں جو لچکدار رویے کے حامل ہوں اور بہت ہی زیادہ سخت ومتعصّب نہ ہوں اور بعض اسلامی مسائل میں سستی اور کوتاہی کا مظاہرہ کریں اعتدال پسندوں کو برسر اقتدار لانے کے لئے وہ یہ کام کرتے ہیں کہ پچھلے جو متدّین عہدہ دار افراد گذرے ہیں؛ ان

کی معمولی غلطیوں کو (جو کہ ابتدائے انقلاب یا اور دوسرے مشکلات کے سبب ہوگئی تھیں) بڑا بنا کر پیش کرتے ہیں اور ان س سوء استفادہ کر کے ان ذمہ داروں اور عہدہ داوں کی عوامی مقبولیت کو کمزور کر دیتے ہیں تا کہ وہ طاقتیں جو کسی حد تک اسلامی اقدار سے دور ہیں اور کم و بیش مصالحت پر آمادہ ہیں اور ان کے اقتدار میں آنے کا راستہ صاف ہو جائے۔اس درمیان ہم کو یونیورسٹی اور وہاں رہنے والوں سے کبھی بھی غافل نہیں ہونا چاہئے کیونکہ یہ لوگ ہر حال میں سماج کے موثر اور آئندہ کے ملک کی باگ ڈور سنبھالنے والے ذمہ دار افراد ہیں ان کے لئے ہم کو الگ سے سوچنا ہوگا اور علیحدہ نظام و پلان بنانا ہوگا، خلاصہ یہ کہ یہ مفصّل اور منظّم طور پر بنائے ہوئے ایک فلمی ڈرامے کے مانند ہے کہ دشمن جس کے پردوں کو یکے بعد دیگرے اٹھا رہا ہے اس ڈرامے میں آپ اجنبی یا ان افراد کو جو کہ اسلام اور انقلاب کے دشمن ہیں یا ظاہری طور پر انقلاب یا اسلام کے مخالف ہیں بہت ہی کم دیکھئے گا اکثر آپ ڈرامہ میں ان لوگوں کو کھیلتے ہوئے دیکھئے گا جو اسلام کا اعتقاد رکھتے ہوں چاہے وہ ظاہری ہی کیوں نہ ہو، ضروری نہیں ہے کہ امریکہ کا ایک آدمی یا سی آئی اے تنظیم کا ایک جاسوس آئے اور وہ یہ کام انجام دے بلکہ آپ خود دیکھتے ہیں کہ ایک وزیر یا نائب وزیر جو نمازی اور روزہ دار بھی ہے کربلا اور سوریہ کی زیارت بھی کی ہے حج پر بھی گیا ہے اکثر خمس و زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہے اور یہاں تک کہ کبھی وہ حافظ قرآن بھی ہوتا ہے لیکن اس کی فکر اور چال ایک سو اسیّ درجہ امام خمینیسے مختلف ہوتی ہے، یہاں تک کی آپ بعض ایسے لوگوں کو دیکھیں گے جن کا نظریہ آج پہلے سے بہت حد تک بدلا ہوا دکھائی دیگا، مثال کے طور پر ایک ایسا شخص جو امریکی سفارت

خانے پر قبضہ کرنے میں شریک تھا اور اس کام میں اس شخص نے اہم رول ادا کیا تھا لیکن آج وہی شخص اس کام کی مذمت کر رہا ہے اور مغربی مملک میں جا کر ایک ٹی وی کے پروگرام میں اسی جاسوس سے ہاتھ ملاتا ہے اور اس کے ساتھ ایک میز پر بیٹھتا ہے اور سب کے سب ایک ساتھ کھاتے پیتے ہیں اور ہنسی مذاق کرتے ہیں۔ وہی شخص جو دو تین سال پہلے اس بات پر معترض تھا کہ ایک پارلیمنٹ کا ممبر انگلینڈ کے سفر میں نا مناسب باتیں کیوں کرتا ہے اور اس پر امریکی ہونے کا الزام لگا رہا تھا آج وہی شخص امریکہ سے رابطہ اور گفتگو کے لئے مشورے دے رہا ہے، کل تک امریکہ مردہ باد کا نعرہ خود لگاتا تھا آج اس کے متعلّق کہتا ہے کہ چند سر پھرے لوگ ہیں جو یہ کام کرتے ہیں۔ آج میں ایسے لوگوں کو دیکھتا ہوں جو جنگ کے زمانے میں دوسرے لوگوں سے زیادہ جنگ کے حق میں تھے آج اسی جنگ پر اعتراض کرتے ہیں البتہ حقیقت یہ ہے کہ انھیں لوگوں میں بہت سے لوگ جو انقلاب کے ابتدائی دنوں میں سخت نعرے لگاتے تھے اس پر ان کا دلی اعتقاد نہیں تھا زیادہ تر جذبات اور ماحول کے زیر اثر ان نعروں کو وہ دہراتے تھے اس طرح کے لوگ خود اپنے بقول دلیلوں کے تابع ہو گئے ہیں اور اپنے تصور میں جذبات کی وادی سے نکل کر عقل کے مرحلہ میں داخل ہو گئے ہوں اور کہتے ہیں کہ ہماری پہلے کی حرکتیں اور باتیں غلط تھیں۔ میں مناسبت کی وجہ سے اسی جگہ اشارہ کر رہا ہوں کہ اس حساب سے جو لوگ ماضی میں انقلابی کردار ادا کئے ہوں اور انقلاب کے سلسلے میں امام خمینیکے معین و مددگار ہوں یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہم ان کے عقاید اور نظریات کو پوری طرح سے قبول کر لیں؛ کیونکہ ہم امام خمینیکے بہت سے ساتھیوں اور دوستوں

کو دیکھتے ہیں کہ وہ امام خمینیکے افکار اور بنیادی اصول میں شک رکھتے ہیں اور امام خمینیکے افکار کو صحیح نہیں جانتے ہیں، البتہ بہت سے ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہین کہ ان کا اختلاف ہم سیز یادہ تر سلیقہ اور روش کی حد تک ہے اور یہ معمولی اختلاف اس چیز کا سبب نہ بننے پائے کہ ہم ان کو پوری طرح سے امام خمینیکے دوستوں سے جدا کردیں اور ان کو دوسروں کا کارندہ وحامی تصور کریں اور ان سے سیاسی کشمکش اور اختلاف کو اختیار کریں۔

پچھلی گفتگو کا خلاصہ

بہر حال اس جلسے اور پچھلے جلسے کا خلاصہ اور نتیجہ یہ ہے کہ انقلاب کے شروع میں شناخت وتفکّر کے اسباب بہت کم رکھتے تھیاور خاص سبب جو اس بات کا باعث ہوا کہ لوگ امام خمینیکے پیچھے حرکت کریں اور انقلاب لا کر اسکو محفوظ رکھیں وہ ان کے دینی احساسات اور جذبات تھے البتہ یہ صرف امام خمینی کا ہنر تھا کہ آپ نیان احساسات اور جذبات کو انقلاب کی سمت میں لا کر رہبری فرمائی اور اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کیالیکن انقلاب کی تحریک کو باقی رکھنے اور اس کو جاری رکھنے کے لئے زیادہ سے زیادہ فکری اور ثقافتی کام کرنا لازم ہے

آج یہ سوچنا غلط ہے کہ ہم اس تصوّر میں رہیں کہ جب چاہیں لوگوں کے دینی احساسات پر بھروسہ کرتے ہوئے ماتم اور حسین حسین کے ذریعہ اس انقلاب کو محفوظ رکھ سکتے ہیں اور اس کام کو آگے بڑھا سکتے ہیں وہ صرف امام خمینیکی ذات تھی جو کہ روحانی، عرفانی اور الٰہی شخصیت کی مالک تھی ؛اپنی اس عظیم شخصیت کے ذریعہ وہ دلوں پر حکومت کرتے تھے اور لوگوں کے

احساسات اور جذبات کو اپنے تابع کر لیتے تھے ایسی بات اگر ہم کرنا چاہیں تو ممکن نہیں ہے ہم کو چاہیئے کہ ہم اسلام کو اچھّی طرح پہچانیں اور دوسروں کو پہچنوائیں

آج بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنی فکر و عمل میں غلطی اور انحراف رکھتے ہیں حقیقت میں یہ جان بوجھ کر اپنے کام میں غلطی نہیں کرتے ہیں یہ کمزوری صرف شناخت نہ ہونے کا نتیجہ ہے یہ ایسے لوگ ہیں کہ اپنی تعلیم کے دوران اگر بہت زیادہ مسلمان تھے تو بس اتنا کہ نمازی اور روزہ دار تھے ان چیزوں کا ان کے پاس وقت ہی نہیں تھا کہ وہ اسلام کے اصول ومبانی کی شناخت اور تحقیق کریں؛اس کے بعد جب ملک کے کسی اہم عہدہ پر متمکن ہوئے تو اتنی فرصت کہاں ملتی ہے؛اپنے ہی کام کے لئے وقت نہیں ملتا تو بھلا پھر کیسے وہ اسلام کے اصول و مبانی کے متعلق تحقیق کریں گے؟ آج ہی ہم کو یہ کام کرنا چاہیئے اور اس بات کی فکر ہونی چاہیئے کہ یہ لوگ اسلام کو بہتر طریقے سے پہچانیں یہ کوئی شرم کی بات نہیں ہے ہم کو یہ نہیں سوچنا چاہیئے کہ یہ تعلیمات صرف مدرسے کے بچّوں اور یونیورسٹی کے طالب علموں کے لئے ہے ایسا نہیں ہے بلکہ سماج کے ہر طبقے کے لوگوں کو اس کی سخت ضرورت ہے لیکن ایسا بھی نہیں ہونا چاہیئے کہ ہم وزیر یا اس کے نائب سے کہیں آ ؤ کلاس میں بیٹھ کر یہاں پڑھو

ہاں یہ ممکن ہے کسی ذریعہ اور بالواسطہ طور سے ان کے کانوں تک یہ بات پہونچا دی جائے اور کسی نہ کسی طرح سے وہ لوگ ان باتوں سے واقف ہو جائیں؛ جو لوگ آج کل ملک کی سیاست میں اہم عہدہ رکھتے ہیں ان کے علاوہ ہم کو ان لوگوں کے بارے میں بھی فکر ہونی چاہیئے جو آگے چل کر اس عہدے پر فائز ہونے والے ہیں اور وہ دراصل یہی طالب علم ہیں

جو آج کل مدرسوں یا یونیورسٹی میں پڑھ رہے ہیں؛ مستقبل کے ذمہ داروں اور عہدے داروں کے متعلق ہم کو ابھی سے فکر کرنی ہوگی اور ہم کو اس کی پلاننگ کرنی ہوگی، یہاں پر مناسب ہوگا کہ ان باتوں سے متعلق ایک مثال کو بیان کروں:

ایک بڑے اسلامی ملک جسکی آبادی ہمارے ملک سے زیادہ ہے وہاں کے صدر جمہوریہ سے پوچھا گیا کہ آپ اس طرح امریکہ پر کیوں منحصر ہیں انھوں نے جواب دیا کہ امریکہ نے ہمارے ملک کے دو ہزار بڑے اور تعلیم یافتہ افراد کو مختلف حصّوں سے ذخیرہ کرلیا ہے او رانھیں میں سے ہر مرتبہ چالیس افراد ملک کے بڑے عہدوں پر بنے رہتے ہیں یہ ذخیرہ اندازی برابر جاری رہتی ہے آپ اس ملک سے جہاں کے دو ہزار لوگ سیاست کے بلند مقام پر ملک میں فائز ہوں اور ان لوگوں کی تعلیم اور تربیت امریکہ میں ہوئی ہو، کیا توقّع رکھتے ہیں؟

امریکہ نے اس سیاست کو پچاس سال پہلے اپنایا تھا اور آج اس کا فائدہ حاصل کر رہا ہے؛ اگر ہم آپ یہ چاہتے ہیں کہ اس ملک میں آگے پچاس سال تک اسلامی حکومت قائم رہے تو اس کے لئے آج ہی سے پلاننگ کرنی ہوگی اور آیندہ ہونے والے ذمہ دار افراد کے بارے میں فکری اور ثقافتی کام کو انجام دینا ہوگا یہ نہیں کہ ہم بیٹھے رہیں اور جب کوئی مصیبت نازل ہو تو اس کو دور کرنے کے لئے نئے سرے سے غور و فکر کریں یہ عقلی اور منطقی کام نہیں ہے بلکہ اس کی فکر ہم کو پہلے سے کرنی ہوگی۔

اساتید کرام! میں نے اس گفتگو میں جو وقت لیا ہے اسی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے کہ

انھیں طالب علموں سے جو آپ کے ماتحت تعلیم حاصل کرر ہے ہیں آ گے چل کر ملک کے ذمہ دار صدر جمہوریہ سے لیکر وزیر اور نائب وزیر، پارلیمنٹ کے ممبر اور تعلیم و تربیت کے مدیر ہونگے ؛ لہٰذا آپ لوگوں کو خود اسلام کے اصول اور عقیدے کے بارے میں گہری نظر اور شناخت رکھنی چاہیئے تا کہ آپ طالب علموں کو منتقل کر سکتے ہوں۔لیکن اگر کسی طالب علم نے آپ سے کوئی سوال کیا اور آپ اس کو مطمئن نہیں کر سکے تو وہ یہی کہے گا کہ جب یونیورسٹی کے بزرگ استاد سے جواب نہیں ہوسکا تو معلوم ہوتا ہے کہ اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے اس کے بعد اگر ہم جیسے عالم دین سے پوچھا اور جواب اس نے بھی نہیں دیا تو اس کے لئے یقینی ہو جائے گا کہ اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے لہٰذا یہ لوگ جو خدا، رسول، اسلام اور مسلمانوں کے متعلّق گفتگو کرتے ہیں اس کی کوئی اساس اور بنیاد نہیں ہے۔

آخری نتیجہ یہ ہے کہ میں عالم دین ہونے کی وجہ سے اور آپ لوگ یونیورسٹی کے استاد ہونے کی حیثیت سے اہم ذمہ داری رکھتے ہیں جس کے ذریعہ سے ہم لوگ کلچر کی اصلاح نیز اس ملک کی آئندہ آنے والی نسلوں کی تعلیم و تربیت میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں دوسروں کے بہ نسبت ہم لوگوں کی ذمہ داری زیادہ سنگین اور عظیم ہے لہٰذا ہم کو چاہیئے کہ اپنے علم کو وسیع اور مضبوط کرکے اور اسلام کے اصول ومبانی کو پہچان کر اس عظیم ذمہ داری کو ادا کرنے کے لئے قدم آگے بڑھائیں۔

دینی پلورالزم (۱)

ہمارے زمانے کا عظیم بحران

جس زمانے اور جس دور میں ہم لوگ زندگی بسر کررہے ہیں خاص طور سے آخری دس سالوں کا عرصہ اگر اس کو بحران کے دور کے نام سے یاد کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا؛ انسانی تمدّن کی تاریخ میں مختلف زمانے دیکھے گئے ہیں جو کہ مختلف مناسبتوں کی وجہ سے الگ الگ ناموں سے یاد کئے گئے ہیں لیکن کسی بھی زمانے میں ایسا عظیم ثقافتی بحران نہیں دیکھا گیا کہ ایک اعتبار سے اسے بحرانی ہوسّےت کا نام دیا گیا ہے۔ اگر آج ہم ترقی یافتہ ممالک کے ثقافتی مسائل کے بارے میں توجہ کریں اور گفتگو کریں تو ایک عجیب آشفتگی، سرگردانی، ابہام اور شدید فکری شکّاکیت (شک پرستی) کو دیکھیں گے کہ ایسا شکّاکیت سے لبریز زمانہ کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔

پہلے زمانے میں یونانی کلچر میں "سوفسٹ" نام سے گروہ پیدا ہوا تھا چند دنوں تک تو ان کا نام و نشان رہا؛ لیکن بہت جلد ہی ختم ہو گئے۔ پہلی اور دوسری صدی عیسوی میں ایک مرتبہ پھر شک پرستی کا طوفان "پیرن" اور اس کے چاہنے والوں کی طرف سے ظاہر ہوا؛ اور وہ بھی بہت جلدی ختم ہو گیا؛ اس کے بعد شک پرستی کا تیسرا دور "رنسانس" کے بعد شروع ہوا؛ اس کا اثر پہلے کی بہ نسبت زیادہ رہا؛ لیکن اتنا بھی نہیں کہ دنیا کے تمام اسکولوں، یونیورسٹیوں اور ثقافتی جگہوں پر چھا جائے مگر آخر کے دس سالوں میں شک پرستی کی ایک نئی موج اٹھی ہے جس

کی وسعت وشدت گذشتہ موجوں سے بہت زیادہ ہے وہ اس طرح کہ اس نے چند جگہوں کو چھوڑ کر دنیا کے تمام علمی اور تمدّنی مراکز کو خاص طور سے اسکولوں اور یونیورسٹیوں کو پریشانی اور دردسر میں مبتلا کر دیا ہے؛ تمام طرح کے شکی مکاتب فکر اور فلسفے بہت زیادہ رواج پا گئے ہیں اگرچہ ممکن ہے کہ ظاہری طور پر وہ شکاکیت کا نام نہ رکھتے ہوں، لیکن ان کے مطالب شک پرستی کے عناصر سے خالی نہیں ہیں۔ اور دنیا کا ثقافتی ماحول ایسا ہو گیا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی مسئلہ میں یقین اور حقیقت کا دعویٰ کرتا ہے تو اس کو برا اور ناسمجھ سمجھا جاتا ہے اور اگر کسی کو بےعزّت کرنا ہوتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ یقین پرست اور ڈگماتیزم کا حامی ہے، آج کل یقین پرست ہونا ایک علمی گالی شمار کیا جاتا ہے؛ اور شک پرستی، نسبیت اور مطلق انگاری کی نفی، اس طرح سے دنیا کی فکری اور معاشرتی فضاؤں پر چھا گئی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی چیز کے بارے میں یقینی طور پر اعتقاد رکھتا ہے اور دعوے سے کہتا ہے کہ ہم اس چیز پر یقین رکھتے ہیں اور اس کو پوری طرح سے صحیح سمجھتے ہیں تو اس آدمی کو ناسمجھ، سادہ لوح اور علم وفہم سے خالی تصور کرتے ہیں اور اس کو جاہل افراد میں شمار کرتے ہیں۔

ایک مرتبہ میں نے ایک جگہ پر کہا کہ اگر ہم اس زمانے کو نئی جاہلیت زمانہ کے نام سے یاد کریں تو یہ اسم بامسمّیٰ ہوگا کیونکہ آج کل قابل فخر بات یہ کہنا ہے کہ ہم نہیں جانتے ہیں وہ لوگ کہتے ہیں آج ہمیں اس مقام پر پہونچنا چاہئے کہ اچھّی طرح سمجھ لیں کہ تمام چیزیں مشکوک ہیں اور کوئی چیز یقینی وجود نہیں رکھتی ہے یعنی یہ قابل فخر ہے کہ ہم ہر چیز میں شک وجہل کا اقرار کریں یہ ایک نئی جاہلیت ہے جس کا ہم کو آج کل سامنا ہے؛ یہ اس جاہلیت کے مقابل ہے

جس کوقرآن کریم نے" جاہلیت اولیٰ" کے نام سے یاد کیا ہے(۱)
بہر حال ان لوگوں کی نظر میں" ڈگما تیزم اوریقین پرستی" انسان کی ناسمجھی اور کج فہمی کی دلیل ہے، البتہ ہمارے نظریہ کے مطابق تمام چیزوں میں بھی شک پرستی اور نسبیت کا اعتقاد آج جس کا دفاع کیا جارہا ہے، جہالت اور ناسمجھی کے علاوہ اور کوئی دوسری چیزنہیں ہے، ہم نے قرآن کریم سے سیکھا ہے کہ یقین اور یقینی چیزوں کو حاصل کرو اور اس کو اختیار کرو اور شک وتردید کے پردوں کو اپنے سے دور کرو۔سورہ بقرہ کے شروع ہی میں اس جانب اشارہ ہوا ہے" وباالآخرۃھم یوقنون" (۲)یعنی مومنین وہ ہیں جو آخرت پر یقین رکھتے ہوں ؛ قرآن مجید کا دستور یہ ہے کہ جس جگہ وہ کسی کی سرزنش کرتا ہے یا اس کی مذّمت کرتا ہے اور غلط قسم کے لوگوں کا تذکرہ کرتا ہے تو کہتا ہے: یہ لوگ شک والے ہیں بالکل اس کے خلاف جوکہ آج کی دنیا میں پایا جارہا ہے کہ اگر کسی کی طرف علمی اعتبار سے نامناسب نسبت دینا ہو تو کہتے ہیں کہ یہ اہل یقین ہے۔

....

(۱)سورہ احزاب: آیہ ۳۳۔

(۱)سورہ بقرہ: آیہ ٤۔

پلورالزم تساہل تسامح، بحران پیدا کرنیوالوں کے ہتھکنڈے

بہر حال ہماری نظر میں شک پرستی اور نسبیت کا اعتقاد انسانی معاشرہ کے لئے ایک بہت بڑی مصیبت اور آفت ہے کم سے کم ہمارے سماج کے لئے اس بات کا سبب ہے کہ

ہماری اعتقادات اور ثقافت جن کے لئے ہم نے قربانی پیش کی ہے اور ان کے وجود کے لئے صدیوں ہم نے زحمت برداشت کی ہے تاکہ وہ عالم وجود میں آئیں، وہ سب ختم ہو جائے ؛اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس عالمگیر شک پرستی کی موج و آفت] جو کہ ایک فاجعہ اور خطرناک بیماری ہے [کے مقابلہ میں کیا کیا جائے؟ ہم ایک اسلامی ملک اور حکومت ہونے کی وجہ سے جس طرح دوسرے شعبوں اقتصاد و صنعت وغیرہ میں مختلف کارنامے انجام دیتے ہیں ان کے علاوہ اس ادبی اور ثقافتی میدان میں کون سا کام انجام دیں؟ البتہ ثقافت سے ہماری مرادنئی اصطلاح میں رقص وسرود نہیں ہے بلکہ دینی اصولا اعتقادات اور اقدار ہیں ہماری نظر میں اسلام ایک قطعی اصول اور محکم اقدار کا نام ہے ہمارا وظیفہ اور ذمہ داری یہ ہے کہ سب سے پہلے ہم انکی حفاظت کریں اس کے بعد دوسروں کو ان کی جانب دعوت دیں نہ یہ کہ سیکو لرازم، لیبرال ازم، پلورل ازم اور دوسرے کئی ازم اور نظریوں کے مقابلہ میں پیچھے ہٹ جائیں اوران کے اثرات کو قبول کرلیں۔ آج اس ملّت کے دشمن کوشش کررہے ہیں کہ مختلف ثقافتی حیلوں کو وسیلہ بنا کرلوگوں خصوصاً جوانوں کے اعتقاد، اعتماد اور یقین، کو زیر سوال لا کر متزلزل کردیں اور انھیں حیلوں میں ایک حیلہ" پلورالزم" نام کی ایک خطرناک فکر ہے جس کی وہ لوگ ترویج کرتے ہیں؛ اس کی اہمیت کے اعتبار سے ضروری ہے کہ اس کے بارے میں کچھ عرض کروں۔

پلورالیسٹ کہتے ہیں انسان مختلف عقیدوں اور فکروں کے مجموعہ کا نام ہے اور وہ مختلف راہ و روش رکھتا ہے اور ہر عقیدہ اور راہ و روش جو کسی بھی معاشرہ سے متعلق ہو اور وہ اس کو پسند کرتا ہو تو

وہ محترم ہے ہم کو چاہئے کہ ہم ان کی فکر ونظر کا احترام کریں البتہ دوسروں کو بھی ہماری فکر ونظر کا احترام کرنا چاہئے ۔ہم کو نہ تو کسی کی فکر ونظر سے چھیڑ چھاڑ کرنی چاہئے اور نہ تو اس بات کا انکار کرنا چاہئے کہ دوسروں کی فکریں ہماری فکروں کی جانشین ہوجائیں کسی شخص کو بھی اپنی فکر کے حوالے سے مطلق تصوّر نہیں کرنا چاہئے بلکہ اس بات کو نظر میں رکھنا چاہئے کہ دوسرے لوگ بھی الگ فکر ونظر کے مالک ہیں اس پر کوئی دلیل نہیں ہے کہ ہماری فکر ونظر صحیح ہے اور دوسروں کی غلط ہے آپ کس اصول کی بناء پر دوسروں کے نظریات کو غلط سمجھتے ہیں اور فقط اپنی فکر کو صحیح جانتے ہیں؟ اگر آپ مسلمان ہیں اور اسلام کو قبول کرتے ہیں تو دوسرے لوگ بھی ہیں جو مسیحیت، بودھ ایزم اور دوسرے مذاہب کو قبول کرتے ہیں اس بات کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے کہ آپ کا اسلام ان سے افضل وبرتر ہے؛ ہم سب کو چاہئے کہ ایک دوسرے کا بھی اور ان کے عقائد کا بھی احترام کریں اور تعصب ودشمنی نہ رکھیں اور اس بات کی کوشش میں نہ رہیں کہ دوسرے لوگوں کو بھی لازمی طور پر اپنے مذہب اور دین کے اندر داخل کریں، ہم کو چاہئے کہ ہم دوسروں کے افکار وعقائد سے چشم پوشی کریں اور ان سے اتسامح وتساہل کے ساتھ برتاؤ کریں اور اس بات کا احتمال رکھیں کی شاید دوسرے لوگ بھی حق پر ہوں اور سچ کہتے ہوں۔

جیسا کہ پہلے اشارہ ہو چکا ہے یہ فکر حقیقت میں وہ ہتھیار ہے جس کو دنیا کی استعماری طاقتیں اسلامی کلچر کو روکنے خاص طور پر اسلامی انقلاب کے اثرات کو پھیلنے سے روکنے کے لئے استعمال کرتی ہیں اسکے ساتھ ساتھ مغرب کے مادی اور الحادی کلچر کو رواج دینے کے لئے بھی یہ کوششیں ہیں؛ آج ہم خود اس بات کے شاہد ہیں کہ بعض نشریات، اور تقریروں، جلسوں میں

اسی فکر کو رواج دینے کی کوششیں کی جارہی ہیں اور اس کے نفوذ واثر کا دامن اتنا وسیع ہے کہ بعض ایسے افراد جن کے متعلق گمان بھی نہیں کیا جا سکتا ان کو بھی اس فکر سے متاثر ہوتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔

جوانوں سے متعلق ہماری اہم ذمہ داری

حضرت امام خمینی کی زندگی میں آپ کی بزرگ شخصیت کا لوگوں پر اتنا اثر تھا کہ وہ لوگ آپ سے والہانہ محبت کرتے تھے بے چون و چرا آپ کی باتوں کو قبول کرتے تھے اور آپ کے نظریہ اور رفتار و گفتار کو مانتے تھے تمام ذمہ دار افراد کے درمیان حتیٰ عوام الناس کے درمیان آپ کی بات حرف آخر رکھتی تھی؛ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ صرف آپ ہی کی شخصیت ایسی تھی ۔ یہ حقیقت ہے کہ ایسی چیزیں ہمیشہ اور ہر نسل میں باقی نہیں رہتی ہیں لہٰذا ہم کو اس بات کی فکر کرنی چاہیے کہ اگر وہ راہ اور فکر حقیقت میں صحیح اور درست تھی تو ہم کو منطق اور دلیلوں کے ذریعہ اس کی حمایت کرنی چاہئے اور اس کی بنیادوں کو مضبوط کرنا چاہئے اور اس کو پھیلانا چاہئے؛ خاص طور پر آئندہ نسلوں کے لئے ہمارا صرف یہ کہنا (امام خمینینے یہ کہا اور امام خمینینے یہ کیا) کافی نہیں ہے،

وہ عشق وجذبہ جو کہ انقلاب کے شروع اور پہلی نسل میں پایا جاتا تھا اور ان کے اندر جو شہادت کا جذبہ تھا، جس کو میدان جنگ میں دیکھتے تھے ظاہر ہے آنے والی نسلوں (یا ان لوگوں میں جنھوں نے امام خمینیکے ملکوتی چہرے کو نہیں دیکھا ہے یا جو لوگ ہر ہفتے یا روزانہ امام خمینیکے

حکیمانہ جملوں کونہیں سنتے) کے اندرنہیں پایا جا سکتالہذا ہم کو چاہیئے کہ واضح دلیلوں اور منطقی باتوں سے انھیں مطمئن کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

حقیقت میں اگر ہم ان نو جوانوں کی جگہ پر ہوں جو کہ ابھی جلدی ہی رشد و کمال پر پہونچے ہیں اور وہ مختلف نظریات اور مکاتب فکر سے روبرو ہوں تو ہم دیکھیں گے کہ مسئلہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ ہم سمجھتے ہیں۔ ان جوانوں کے لئے جو چیز قابل سوال ہے وہ یہ کہ اتنے نظریات جو کہ اس دنیا میں ضد و نقیض کی صورت میں پائے جاتے ہیں کیا دلیل پائی جاتی ہے کہ امام خمینی کا نظریہ ہی صحیح اور درست ہو؟ کون سی دلیل پائی جاتی ہے کہ اسلام ہی سب سے اچھا دین ہے اور اس کا راستہ سب سے اچھا راستہ ہے کیا دنیا میں مسیحی دین اور دوسرے دین کے ماننے والے کثیر تعداد میں نہیں پائے جاتے ہیں آپ کو کہاں سے معلوم ہوا کہ انکا عقیدہ اسلام اور امام خمینیسے بہتر نہیں ہے، میں کیوں اسلام، انقلاب اور امام خمینیکو قبول کروں؟ یہ اور اس جیسے دوسرے سوالات اور مسائل ہیں جو کہ ہمارے جوانوں کے ذہن میں پائے جاتے ہیں اور انکے ذہنوں کو جھنجوڑتے رہتے ہیں اور کبھی کبھی تو واضح طریقہ سے ان باتوں کو زبان پر لاتے ہیں اور ان کا اظہار کرتے ہیں اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ ایک مناسب ذہنی میدان اور ماحول" پلورالیزم" کی ترویج کے لئے دین وثقافت کے حدود میں میں پایا جا رہا ہے۔

میں خود دنیا کے مختلف ملکوں میں ایسے لوگوں سے ملا ہوں جو کہ مسیحی تھے لیکن کہتے تھے کہ اسلام بھی اچھا دین ہے لیکن جب میں نے ان سے سوال کیا کہ پھر کیوں نہیں مسلمان ہو

جاتے تو جواب میں کہتے ہیں چونکہ مسیحیت بھی اچھا دین ہے۔حتیّٰ اس سے بھی بڑھ کر آج پاپ (مسیحیوں کا رہنما) بھی اعتراف کرتا ہے کہ اسلام ترقی یافتہ اور اچھا دین ہے لیکن کبھی یہ نہیں کہتا کہ مسیحیت برا دین ہے یا اسلام مسیحیت سے بہتر ہے جب مسیحیت کا راہبر یہ اعلان کرتا ہے کہ اسلام بہت سی خوبیوں کا دین ہے تو یہ خود بخود اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ دو اچھے دین ہیں ایک اسلام اور ایک مسیحیت۔اگر آپ بودھ مذہب کے رہبر (بودھ ایسا مذہب ہے جسکے ماننے والے کروڑوں کی تعداد میں موجود ہیں) سے ملاقات کریں گے تو ممکن ہے وہ بھی کہے کہ بودھ اچھا دین ہے اسلام بھی اچھا مذہب ہے یہ وہی دینی پلورالیزم ہے یعنی ہم ایک اچھا اور برحق دین نہیں رکھتے بلکہ حق پر کئی دین ہیں کسی کو بلا وجہ یہ ضد نہیں کرنی چاہیئے کہ جنت میں جانے اور سعادت مند بننے کے لئے مسلمان ہونا ضروری اور شرط ہے بلکہ مسیحی ،زرتشتی ،بودھ اور دوسرے لوگ بھی جنت میں جاسکتے ہیں اور سعادتمند بن سکتے ہیں اسی طرح ایک دین کے اندر بھی مختلف مکاتب فکر کو بھی ایک دوسرے پر ترجیح نہیں دینی چاہیئے ؛ بلکہ سب کے سب اچھے اور حق پر ہیں جیسے اسلام مذہب میں سنی اور شیعہ ہیں یا مسیحیت میں" کیتھولک"" پروٹیسٹان اور" ارتڈوکس" لہذا ایک دوسرے کے باطل یا غلط ہونے کا نظریہ نہیں رکھنا چاہیئے۔

پلورالیسٹ کیا کہتے ہیں

پلورالیسٹ دینی پلورالزم کی تائید کے لئے پلورالیزم کے دوسرے مظاہر کے ذریعہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ دینی پلورالیزم بھی صحیح ہے مثلاً کہتے ہیں آج دونیا کے مملک مختلف حکومتی روش اور سسٹم کے تحت چل رہے ہیں؛ بعض ترقی یافتہ ممالک مثلاً انگلینڈ، جاپان وغیرہ میں بادشاہی حکومت پائی جاتی ہے اور دوسرے کئی ملکوں میں جمہوری حکومت پائی جاتی ہے؛ جمہوری حکومتوں میں بھی بعض جگہوں پر ریاستی اور کہیں پر پارلیمانی طریقہ حکومت پایا جاتا ہے۔ جب سیاست کے میدان میں حکومت کے مختلف قسم کے سسٹم سے متعلق بحث ہوتی ہے اور اس سوال کے جواب میں کہ (ان تمام سسٹم میں کون سا سسٹم اچھا ہے؟) وہ لوگ کوئی آخری اور فیصلہ کن جواب نہیں دیتے ؛ بلکہ کہتے ہیں کہ ان تمام سسٹم میں بعض اچھائیاں اور خوبیاں بھی پائی جاتی ہیں؛ اور بعض حد بندیاں اور کمیاں پائی جاتی ہے اور کسی سسٹم کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ برا ہے وہ تمام سسٹم اچھے ہیں یہ سیاسی پلورالزم یعنی سیاسی حکومت کے انتخاب میں لازم نہیں ہے کہ ہم کہیں یہ طریقہ حکومت اچھا اور صحیح ہے اور بقیہ حکومت کے سسٹم اور طریقے غلط اور باطل ہیں اسی طرح ایک حکومت یا کابینہ کے بنانے اور تشکیل دینے میں کئی الگ الگ پارٹیاں ہوتی ہیں یہ بھی ایک سیاسی پلورالزم کا نمونہ ہے۔ وہ مختلف پارٹیاں جو کہ ایک ملک میں پائی جاتی ہیں اور الگ الگ نظریات اور فکریں رکھتی ہیں بلکہ نظریاتی اعتبار سے ایک دوسرے کی مخالف ہوتی ہیں ان کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ صرف ایک پارٹی صحیح اور باقی دوسری غلط ہیں اور ان کو چھوڑ دیا جائے۔ اصولی طور پر اگر آج دنیا میں تمام لوگ متفقہ

طور پر صرف ایک پارٹی کے طرف دار ہوں تو یہ لوگ اسکو عقب ماندگی کی نشانی اور اس پارٹی کی تنزّلی کا سبب سمجھتے ہیں یہ لوگ اس بات کے معتقد ہیں کہ ترقی یافتہ ممالک اور متمدن معاشرہ ضروری طور پر مختلف سیاسی نظریات رکھتے ہوں اور لوگ الگ الگ گروہ کے طرف دار ہوتے ہیں بنیادی طور پر مختلف نظریوں کا پارٹیوں میں ہونا اس بات کا سبب بنتا ہے کہ آپس میں رقابت پیدا ہو، وپارٹی حکومت میں نہیں ہے وہ حکومتی پارٹی کے کارناموں کو دیکھے اور اس پر نظر رکھے نیز ہر پارٹی ایک دوسرے کی کمیوں اور کمزوریوں پر نظر رکھے اس طرح ہر پارٹی اپنے کاموں پر نظر رکھتی ہے اور کوشش کرتی ہے کوئی کمی اور غلطی نہ ہونے پائے اگر غلطیاں اور کمزوریاں ہیں تو اس کا ازالہ کیا جائے نیز اس بات کی ہر پارٹی کوشش کرتی ہے کہ سبھی کام کو اچھے طریقے سے انجام دیا جائے تا کہ لوگوں کے ووٹوں کو اپنی طرف کھینچ سکیں؛ انھیں سب وجہوں سے ذمہ دار اور سیاسی افراد اپنے ملکوں میں ترقی دیتے ہیں کہ نتیجہ میں جس کا فائدہ اس معاشرہ کے تمام عوام کو پہونچتا ہے۔اس بنیاد پر ہم دیکھتے ہیں کہ سیاسی پلورالزم اور چند پارٹیوں کا ہونا ایک پسندیدہ اور فائدہ مند بات ہے اور وہ سیاسی سسٹم اور طریقہ کار جو ایک ہی پارٹی میں محدود ہو سیاسی پلورالزم کے مقابلہ میں نامناسب اور بیکار ہے۔

اسی طرح اقتصادی میدان میں بھی یہ بات بہت حد تک واضح ہے کہ مختلف اور متعدد نظریے اور کئی اقتصادی طاقتوں اور ذرائع کا ہونا ہی اچھا اور قابل قبول ہے اور ایک محور کا اقتصاد بہت زیادہ نقصاندہ اور عیب کا باعث ہے اور یہ قابل دفاع بھی نہیں ہے۔جس میدان میں کئی اقتصادی محور موجود ہونگے وہاں آپس میں رقابت پیدا ہوگی اور رقابت کے نتیجہ میں اچھی

چیزیں بہتر صورت میں بہت کم قیمت پر استعمال کرنے والوں تک پہونچیں جائیں گی اور اقتصادی مارکیٹ میں اچھی طرح وسعت اور ترقی بھی اسی رقابت کے ذریعہ ہوتی ہے جبکہ ایک محوری اقتصاد میں محدودیت پیدا ہو جاتی ہے اور رقابت نہ ہونے کی وجہ سے عام طور پر چیزوں کی کیفیت اور بناوٹ اچھی بھی نہیں ہوتی اور قیمت بھی زیادہ ہوتی ہے اور اس میں ترقی اور وسعت چند محوری اقتصاد کی بہ نسبت بہت کم ہوتی ہے لہٰذا ان سب باتوں کی وجہ سے اقتصادی پلورالزم قابل قبول اور فائدہ مند ہے۔

پلورالیسٹ اس طرح کی باتیں ذکر کر کے نتیجہ نکالتے ہیں کہ جس طرح پلورالزم اور کثرت خواہی مختلف جگہوں جیسے سیاست، اقتصاد اور دوسری چیزوں میں اچھی چیز ہے اسی طرح دین اور کلچر میں بھی پلورالزم اور کثرت گرائی پائی جانی چاہیے؛ تاکہ اس طرح سے تمام ادیان کے معاشرہ اور سماج کے اندر پوری طرح سے فراہم ہونا چاہئے اور اعتقادی نظریہ سے بھی اس بات کا یقین رکھیں کہ مختلف ادیان میں کوئی برتری نہیں پائی جاتی ہے اور ان میں کسی ایک دین کو قبول کرنے کی حیثیت بقیہ تمام ادیان قبول کرنے کے برابر ہے لہٰذا دینوں میں حق و باطل کا قائل ہونا اور ان کو اچھے برے میں تقسیم کرنا یا ان کو اچھے اور برے عنوان سے یاد کرنا یہ سب پوری طرح بے بنیاد اور بے فائدہ ہے اور عیسائی، مسلمان، شیعہ اور سنی، کیتھولیک اور پروٹیسٹ خلاصہ یہ کہ تمام ادیان نیز فرق و مذاہب حقیقت تک پہونچنے کے راستے اور منزل مقصود اور ساحل نجات تک پہونچانے والے صراط مستقیم ہیں، اور ان میں سے کسی ایک پر تعصب کرنا بے عقلی اور غیر منطقی ہونے کی دلیل ہے عقلمند انسان جس طرح اقتصادی اور سیاسی

پلورالزم کو قبول کرتا اسی طرح وہ اس کو دین کے بارے میں بھی قبول کرتا ہے اور دین میں کثرت کا ہونا پوری طرح سے فطری اعتبار سے قابل قبول اور معقول ہے۔

بہر حال آج کل یہ فکر ہمارے سماج میں مختلف طریقوں سے ترویج کی جارہی ہے، جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جاچکا ہے واقعاً ہمارے جوانوں کے ذہنوں میں بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حقیقت میں جس طرح ہم لوگ اقتصاد اور سیاست کے میدان میں کثرت کو قبول کرتے ہیں مثلاً اقتصاد کے میدان میں اہل اقتصاد صادرات کو وسیع یا واردات کو کم کرنے اور مکمل طرح سے رشد و وسعت میں کسی ایک ملک سے متعلق ایک خاص نظریہ نہیں رکھتے ہیں ان کے درمیان اختلاف کا ہونا فطری چیز ہے یہ ضروری نہیں کہ سب کے سب ایک نظریہ پر پہونچیں ؛ پھر اب کیا مشکل ہے کہ دین اور ثقافت کے بارے میں بھی اسی چیز (پلورالزم اور کثرت گرائی) کو قبول کریں؟ سچ مچ اس بات پر کیوں ضد اور اصرار ہے کہ میں لازمی طور پر اسلام ہی کو نہ کہ مسیحیت کو قبول کروں؟ حقیقت میں کیا یہ بھی ضروری ہے کہ ایک دین کا پابند اور خدا کے وجود کا اعتقاد رکھوں؟ بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جو خدا کا انکار کرتے ہیں یا خدا کی وجود میں شک وشبہ رکھتے ہیں، یہ بھی ایک عقیدہ دوسرے عقیدوں کے درمیان ہے اور دوسرے عقیدوں جیسا ہی ہے میں کیوں نہ اس عقیدے کو قبول کروں؟

اس لحاظ سے ہم دیکھتے ہیں کہ یہ مسئلہ پوری طرح سے بہت ہی اہم ہے اور ایک مضمون یا کتاب سے زیادہ مطالب کا حامل ہے یہ مسئلہ اس بات کو چاہتا ہے کہ ہمہ آمادہ ہو کر منطقی اور استدلالی جواب کے ساتھ نوجوان نسلوں کے سوالات کے جواب دینے کے لئے حاضر ہوں

اور اس شبہ کو حل کریں۔

پلورالسٹ کے پہلے بیان پر تنقید

مذکورہ بیان جو کہ پلورالزم کہ تائید کرتا ہے سب سے پہلے اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ منطقی لحاظ سے یہ ضروری نہیں ہے کہ اگر ہم اقتصاد و سیاست میں کثرت گرائی کو قبول کرتے ہیں تو دین اور کلچر میں بھی اس کو قبول کریں؛ پلورالزم کے مذکورہ بیان میں جو کچھ کہا گیا تھا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ" چونکہ سیاست واقتصاد اور دوسرے امور میں کثرت گرائی فائدہ مند ہے اور لوگ اس کو پسند کرتے ہیں؛ لہٰذا دین وثقافت کے مطالب میں بھی کثرت گرائی مفید و مطلوب ہے"

ہماری اصلی بحث اسی میں ہے یہ مطلب صرف ایک دعویٰ ہے اس پر کوئی دلیل پیش نہیں کی گئی ہے یہ مطلب ایسا ہی ہے جیسے کہ کوئی کہے" چونکہ فٹ بال کے کھیل میں گیارہ کھلاڑیوں کا ہونا مفید ومطلوب ہے لہٰذا والی بال کے کھیل میں بھی گیارہ کھلاڑیوں کا ہونا مفید ومطلوب ہے"

حقیقت میں جس طرح یہ دوسرا دعویٰ بغیر دلیل کے ہے اور تعجب انگیز ہے اسی طرح پہلا دعویٰ بھی ہے۔ اس کے بارے میں تھوڑی وضاحت اس طرح سے ملاحظہ ہو یہ صحیح ہے کہ اقتصادی، سیاسی اور اس جیسے دوسرے بعض ایسے مسائل ہیں کہ ان کا جواب ایک نہیں ہے ان کے جواب میں کثرت اور زیادتی ممکن ہے بلکہ کبھی کبھی صحیح اور پسندیدہ بھی ہے لیکن بعض دوسرے مسائل ایسے بھی ہیں جن کا جواب صرف اور صرف ایک ہی ہے، ان کا جواب ایک

سے زیادہ قابل قبول اور قابل تصوّر نہیں ہے جیسے ریاضی،فزکس اور ہندسہ وغیرہ،مثلاً حساب میں ۲ ضرب ۲ کا جواب فقط ٤ ہے اس کے علاوہ کوئی دوسرا جواب صحیح نہیں ہے یا ہندسہ میں ۳ زاویئے جو کہ مثلث اعتبار سے برابر ہوں جو کہ دلیل سے ثابت ہوتے ہیں اس کا جواب صرف ۱۸۰ درجہ ہی ہوگا اس کے علاوہ دوسرا کوئی جواب نہیں ہے یا ایک مسافت کا حساب لگایا جائے جو کہ ایک متحرک معین زمانہ میں مشخص رفتار کے ساتھ طے کرتا ہو تو اس کا جواب ایک ہی ہوگا کہ جس d=v.t فارمولے کے ذریعہ حساب کیا جائے گا،کیا کوئی یہاں پر یہ کہہ سکتا ہے کہ اقتصادی اور سیاسی مسائل میں جس طرح مختلف نظریئے پائے جاتے ہیں اور اس کا ایک جواب نہیں پایا جاتا اسی طرح دوضرب دو کے بارے میں بھی ہے اور تمام علم ریاضی کے جاننے والے دوسروں سے علیحدہ جواب دے سکتے ہیں اور ان میں یہ بھی احتمال ہو کہ کوئی صحیح اور کوئی غلط ہو؟ ہاں اس نکتہ کی جانب توجہ ضروری ہے کہ ممکن ہے ریاضی اور اس جیسے مسائل کے جواب دو یا اس سے زیادہ راہ حل رکھتے ہوں؛ مگر آخر میں سارے مختلف راہ حل" ایک جواب تک پہونچیں گے" اور چند راہ حل کا ہونا کئی صحیح جواب کے ہونے سے الگ اور جدا چیز ہے۔

لہٰذا ممکن ہے کہ انسانی وجودات اور معارف میں ہمارے سامنے بہت سے ایسے مسائل ہیں جن کے جواب ایک سے زیادہ ہوں اور ایسے مسائل بھی ہوں؛ جن کے جواب فقط ایک ہوں اور ہمارا اصلی سوال ان لوگوں سے جو پلورالزم دینی کے قائل ہیں یہ ہے کہ آپ کو کہاں سے معلوم کہ دین ان مسائل سے ہے جن کے جواب ایک سے زیادہ نہیں ہے؟ اگر آپ یہ

کہتے ہیں کہ دین اقتصاد اور سیاست کی طرح ہے جس کے کئی جواب ہیں اور اس کے اندر کثرت فائدہ منداور مطلوب ہےتو ہم بھی اس کے جواب میں کہیں گے کہ ایسا نہیں ہے، دین کے مسائل فیزیکس اور ریاضی جیسے ہیں جن کے جواب ایک سے زیادہ صحیح نہیں ہیں،ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ" خدا ہے یا نہیں؟" کا سوال دوضرب دو یعنی دو دو چار مسئلہ جیسا ہے کہ صرف اور صرف اس کے جواب میں ایک ہی بات صحیح ہے۔

پلورالسٹوں کی دوسری دلیل

یہاں پر جو لوگ دینی پلورالزم اور کثرت گرائی کے قائل ہیں وہ اپنے مدّعا کو ثابت کرنے کے لئے دوسری دلیل کا سہارا لیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ انسان سے متعلق جو امور ہیں وہ دو طرح کے ہیں کچھ امور حقیقی اور واقعی ہیں جبکہ کچھ قرار دادی اور اعتباری ہیں، واقعی اور حقیقی امور ایسے ہی ہیں جیسا آپ کہتے ہیں یعنی ان کے جواب صرف ایک ہی ہیں یہ ایسی چیزیں ہیں جو کہ حس اور تجربہ سے ثابت ہیں؛ لیکن جو امور قرار دادی اور اعتباری ہیں جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے وہ امور انسان کے ذوق اور سلیقے اور قرار داد و اعتبار کے علاوہ کوئی حقیقت اور واقعیت نہیں رکھتے اور اسی وجہ سے افراد اور معاشروں کے ذوق اور سلیقہ اور قرارداد و اعتبار کے اختلاف کے سبب بدلتے رہتے ہیں؛ اس کے برخلاف واقعی امور ہیں مثلاً ایک خاص کمرے کی مساحت انسان کے معاملہ اور ذوق وسلیقے سے معین نہیں ہوتی؛ بلکہ حقیقی طور پر اس کمرہ کی پیمائش اتنی ہی ہوگی جتنے میں موزائیک پتھر لگے ہوئے ہیں۔

اموراعتباری میں اصلاًاس طرح کے جملوں کو جیسے بہتر ہے یا بدتر ہے اچھا یا برا ہے صحیح یا غلط ہے یا اس سے ملتے جلتے جملوں کو استعمال نہیں کیا جاتا؛ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ان جیسے جملوں کو استعمال کریں تو ہم کو کہنا ہوگا کہ سب ہی صحیح، اچھے اور بہتر ہیں خراب، غلط اور برے کا یہاں وجود ہی نہیں ہے۔اگر ایک شخص صورتی رنگ کو پسند کرتا ہے اور دوسرا ہرے رنگ کو تو اب کوئی بھی آدمی ایک دوسرے کو غلط نہیں کہہ سکتا ہے اور برے، غلط یا باطل جیسے الفاظ کو استعمال نہیں کرسکتا ہے؛ بلکہ کہنا چاہئے کہ صورتی رنگ بھی اچھا ہے اور سبز رنگ بھی بہتر ہے خلاصہ یہ کہ جو اموراور مسائل اعتباری ہیں ان کا جواب ایک نہیں ہے بلکہ ممکن ہے کہ ان کے جواب ایک سے زیادہ ہوں۔

پلورالسٹ والے دعویٰ کرتے ہیں کہ دین ثقافت اور افکار واقدار اعتباری امور میں سے ہیں اور ذوق وسلیقہ اور قرارداد واعتبار کے تابع ہیں؛ جس طرح اس سوال کے جواب میں کہ(کون سا رنگ اچھا ہے؟) ایک جواب نہیں ہے اور خاص طور سے ایسے سوال بے معنی اور نا مناسب ہیں لہٰذا اس سوال کے جواب میں کہ" کون سا دین اور کلچر اور مکتب فکر بہتر اور صحیح ہے؟)ممکن نہیں ہے کہ ایک ہی جواب کو اختیار کیا جائے؛ ایک لحاظ سے ایسا سوال ہی کرنا بے کار ہے اگر کوئی شخص اسلام کو پسند کرتا ہے اس کے لئے وہ اچھا ہے اگر کوئی مسیحیت کو پسند کرتا ہے تو اس کے لئے وہ بہتر ہے اگر کوئی یہ کہے کہ خدا ایک ہے تو ٹھیک ہے اگر کسی نے یہ کہا کہ خدا تین ہیں تو یہ بھی صحیح ہے اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اگر کسی نے کہا خدا ہے اور کسی نے کہا کہ خدا نہیں ہے تو دونوں کی بات صحیح ہے اور دونوں حق پر ہیں، میں چاہتا ہوں کہ بیت

المقدس یعنی قبلہ اوّل کی طرف رخ کر کے نماز پڑھوں اور آپ چاہتے ہیں کہ کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھیں تو اس میں کوئی بھی مشکل نہیں ہے، دونوں صحیح ہے؛ جس طرح آپ اس کھانے کو پسند کرتے ہیں، اور میں اس کھانے کو پسند کرتا ہوں؛ ایسا ہی دین کا بھی معاملہ ہے میں اسلام کو پسند کرتا ہوں، آپ بودھ کو پسند کرتے ہیں اور ہم میں سے کوئی بھی ایک دوسرے پر ترجیح نہیں رکھتا دونوں میں کوئی بھی دشمنی اور جنگ نہیں ہے بلکہ دونوں ہی بہتر اور اچھے ہیں۔ مثلاً کامیابی اور جیت کے موقع پر مغربی کلچر میں انگلیوں کو ایک خاص شکل میں گھمایا جاتا ہے یعنی [v] بنایا جاتا ہے جب کہ اس حرکت کو ایرانی کلچر مین ایک بے عزتی اور گالی شمار کیا جاتا ہے لیکن اس حرکت پر ہم مغربی مما لک کے لوگون کو غلط نہیں کہہ سکتے کیونکہ یہ ایک قراردادی اور اعتباری چیز ہے بالکل ایسے ہی دینی امور بھی ہیں۔

جس مسئلہ کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے اور پلورالیسٹ یعنی پلورالزم کی تائید کے لئے اسی طرف اشارہ کرتے ہیں اصطلاح میں اس کو" افکار و اقدار میں نسبیت" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے افکار و اقدار میں نسبیت کی بحث اس کا خلاصہ اور نتیجہ یہی ہے کہ اچھا اور برا ہونا نیز فائدہ مند مسائل اور اس کے علاوہ اخلاقی اقدار کی باتیں سلیقے اور قرار داد و اعتبار کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہیں مختلف لوگوں کی نسبت ممکن ہے تفاوت و اختلاف ہو، جس طرح کھانے اور رنگ کے متعلق الگ الگ پسند ہوتی ہے اور مختلف افراد کی نسبت پسندوں میں فرق ہوتا ہے اچھائی اور برائی اور اس کے علاوہ افکار و اقدار بھی اسی طرح سے ہیں؛ جس طرح کھانے اور رنگ کے بارے میں کسی ایک کو مطلق طور پر اچھا نہیں کہا جا سکتا اس لئے کہ ممکن ہے ایک

رنگ یا غذا ایک آدمی کے نزدیک پسندیدہ ہے اور وہی چیز دوسرے کے نزدیک بری اور ناپسند ہے اسی طرح افکار و اقدار اور اخلاقی مسائل کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی ہر انسان اور سماج کی نسبت مختلف ہوتی ہے اور بدلتی رہتی ہے۔

یہاں تک اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ صاحبان پلورالسٹوں نے پہلے تو یہ کہا:

(۱) چونکہ اقتصاد اور سیاست میں پلورالزم اور کثرت گرائی صحیح اور فائدہ مند چیز ہے لہذا دینی امور میں بھی ہم اس بات کو قبول کریں کہ کثرت گرائی ایک اچھی اور مفید چیز ہے،

اس بات کا جواب ہم نے یہ دیا کہ دینی مسائل بھی فیزیک اور حساب جیسے ہیں جو کہ ایک جواب رکھتے ہیں اس میں تکثر اور کثرت گرائی صحیح نہیں ہے۔ (۲) اس کے بعد پلورالسٹوں نے کہا کہ افکار و اقدار میں نسبیت پائی جاتی ہے اور انھوں نے بعض اخلاقی و اجتماعی آداب و رسوم کو پیش کیا اور ثابت کرنا چاہا کہ عام فکری مسائل میں بھی نسبیت پائی جاتی ہے تا کہ بعد میں نتیجہ پیش کر سکیں کہ دین کے امور بھی نسبی ہیں۔

پلورالزم کو ثابت کرنے کی تیسری کوشش

پلورالسٹ اس ذیل میں پچھلی باتوں سے بھی آگے بڑھ کر اس بات کا دعویٰ کر بیٹھے کہ حقیقت اور اصل میں تمام معارف اور مسائل چاہے وہ جس شعبہ کے ہوں ہر جگہ نسبیت پائی جاتی ہے اور اصولی طور پر کوئی شناخت اور معرفت بغیر نسبیت کے نہیں ہو سکتی ہیں بس فرق اتنا ہے کہ بعض جگہوں پر یہ نسبیت بالکل واضح اور روشن ہے اور سب لوگ اس کو جانتے ہیں لہذا آسانی

سے قبول کر لیتے ہیں اور بعض جگہوں پر یہ نسبیت پوری طرح سے واضح نہیں رہتی ہے اور عام لوگوں کا نظریہ ایسی جگہوں پر یہ ہوتا ہے کہ مطلق اور ثابت معرفت کو حاصل کر لیا ہے جب کہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے یہ وہی چیزیں ہیں جن کی طرف ہم نے شروع میں اشارہ کیا تھا اور یہ کہا تھا کہ معرفت وشناخت میں نسبیت کا قول اصل میں وہی شک پرستی ہے جو کہ آخری دس سالوں سے پہلے اور حضرت عیسیٰ سے پہلے اور ان کے بعد بھی دو تین بار فلسفیوں اور دانشوروں کے

یہاں پائی گئی تھی، لیکن یہ نظریہ اس وسعت سے نہیں پھیلا تھا اور اتنا موثر نہیں ہوا تھا لیکن ادھر آخری دس سالوں میں بہت زیادہ پھیل گیا ہے اس نے آج دنیا کی اکثر فکری اور ثقافتی مراکز کو پوری طرح سے اپنی گرفت میں لے لیا ہے، ایک عالم کو آج فخر اس بات پر ہے کہ وہ کہے میں اس بات کو نہیں جانتا اور اس چیز میں شک رکھتا ہوں؛ اگر کوئی شخص علم ویقین کا دعویٰ کرتا ہے تو اس کے دعوے کو نادانی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

بہر حال اگر تمام معارف وشناخت نے نسبیت کے رنگ کو اختیار کر لیا تو دین اور دینی معرفت بھی محفوظ نہیں رہ پائے گی اور وہ بھی نسبی اور تغیر پذیر بن جائے گی اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا اور ہم کہہ سکتے ہیں مثلاً سماج]الف[کے نزدیک اور ان کے نظریہ کے مطابق مسیحی دین صحیح اور بہتر ہے اور وہ حق پر ہے، سماج]ب[کے نزدیک اسلام دین اچھا اور حق پر ہے، بلکہ ممکن ہے کہ ایک ہی سماج کے نزدیک ایک وقت میں ایک دین بہتر اور حق پر ہو اور دوسرے زمانے میں دوسرا دین بہتر اور حق پر ہو اور معلوم نہیں کہ حقیقت اور سچائی کیا ہے؟ اصلاً حقیقت بھی ایک

نسبی مسئلہ ہے اس سماج اور اس زمان کی نسبت حقیقت ایک چیز ہے اور دوسرے زمانے اور سماج کی نسبت دوسری چیز ہے۔
مسلمان پلورالسٹ (بہتر ہے کہ ہم ان کو وہ پلورالیسٹ کہیں جو کہ ظاہری طور پر اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں) دینی پلورالزم کی تائید میں کبھی کبھی قرآنی آیات اور احادیث سے استناد کرتے ہیں اور کبھی مولوی، حافظ اور عطّار وغیرہ کے اشعار پیش کرتے ہیں جن کا مطلب یہ ہے کہ کعبہ، بت خانہ، مسجد، کلیسا یہ سب ظاہری طور پر اگرچہ الگ الگ ہیں لیکن سب کے سب ایک ہی خدا کی تلاش اور خدا پرستی کی ایک ہی حقیقت تک پہونچاتے ہیں جیسے یہ شعر بہت ہی شور وغل کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

مقصود من از کعبه و بت خانه تويي تو
مقصود تويي کعبه و بت خانه بهانه

اے خدا میری مراد کعبہ اور بت خانہ سے تو ہی ہے مقصود اور مراد تو ہی ہے کعبہ و بت خانہ تو ایک بہانہ ہے۔
اس طرح سے پلورالزم کی بحث اجتماعی مسائل میں کثرت پرستی سے شروع ہوتی ہے اور پھر آگے چل کر افکار و اقدار میں نسبیت کی بحث پیش کی جاتی ہے اور آخر میں یہ بحث انسان کے تمام معارف میں نسبیت تک پہونچ جاتی ہے۔ یہ بات بہت ہی واضح ہے کہ اگر پلورالزم کے

نظریہ اور فکر کو قبول کرلیا جائے تو اسلام، انقلاب، امام خمینی اور اسلامی افکار و اقدار کا پابند رہنا لازم و ضروری نہیں رہ جاتا ہے؛ اور ہر طرح کے اعتقاد، اعمال اور رفتار نیز تمام اخلاقی برائیوں کی توجیہ آسانی سے کی جاسکتی ہے اور ان تمام چیزوں کو قبول کرسکتے ہیں اس بحث کو جاری رکھتے ہوئے ان تمام مطالب اور باتوں کی تحقیق وتنقید کریں گے اور مسئلہ کی حقیقت کو روشن کریں گے۔

دینی پلورالزم (۲)

پلورالزم کی بحث کو جاری رکھتے ہوئے مناسب ہے کہ اس جلسہ میں سب سے پہلے ان عقلی اسباب وعلل کا ذکر کیا جائے جو کہ دینی پلورالزم کے پیدا ہونے میں دخالت رکھتے ہیں اس بات سے چشم پوشی کرتے ہوئے کہ ممکن ہے اس فکر کے ہونے میں سیاسی اسباب وعلل بھی ہوں،،کون سا (ان کی نظر میں) منطقی یا عقلی سبب ہے جو اس بات کا موجب اور سبب بنا کہ یہ مسئلہ پیدا ہو؟ سیاسی اسباب کے علاوہ ممکن ہے یہاں پر کم سے کم دو سبب اس مسئلہ کے پیدا ہونے میں دخالت رکھتے ہوں۔

پلورالزم کی پیدائش میں نفسیاتی عوامل کا دخل

پہلا سبب ایک نفسیاتی سبب ہے جس کی وضاحت کچھ اس طرح ہے: اس وقت دنیا میں تقریباً چھ ارب لوگ زندگی گذارتے ہیں؛ جو کہ مختلف دین وفرقہ کے پیرو اور تابع ہیں اور ان

کا اعتقاد بھی کسی ایک دین اور فرقے پر دوسرے ادیان کے ساتھ بغض ودشمنی اور عناد کی وجہ یا انکارحق کی وجہ سے نہیں ہے، بہت سے لوگ کسی خاص فرقے اور مذہب پر صرف اس لئے ہیں کہ وہ جغرافیائی اعتبار سے کسی خاص ملک کے حصّہ میں پیدا ہوئے ہیں، یا یہ کہ ان کے ماں اور باپ کسی خاص مذہب یا دین کے پیرو ہیں اور ان لوگوں نے بھی اس مذہب کو اسی لئے قبول کرلیا ہے اور بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جو کہ واقعی طور پر اپنے دین کے احکام اور دستورات کو قبول کرتے ہیں اور اس کی پابندی کرتے ہیں ؛ اور اس پر عمل کرنے کو لازمی جانتے ہیں ایسی حالت میں اگر ہم یہ اعتقاد رکھیں کہ اسلام کے علاوہ دوسرے تمام دین ناحق اور باطل ہیں اور ان کے ماننے والے جہنمی ہیں، نیز اسلام میں بھی شیعہ اثناعشری فرقے کے علاوہ جتنے فرقے ہیں سب کے سب باطل ہیں اور ان کے معتقد اہل جہنم ہیں، تو ہمیں کہنا چاہئے کہ بیس کروڑ افراد جو کہ شیعوں کی ایک تخمینی تعداد ہے اس کے علاوہ (وہ بھی ایمان اور عمل صالح کی شرط کے ساتھ) سب کے سب پانچ ارب اسّی کروڑ افراد گمراہی اور ضلالت میں ہیں اور وہ جہنمی ہیں اور ان سبھی پر عذاب ہوگا۔ کیا سچ مچ اس چیز کو قبول کیا جاسکتا ہے؟ کیا صرف اس لئے کہ وہ لوگ ایک مسیحی ملک میں پیدا ہوئے ہیں یا یہ کہ ان کے ماں باپ عیسائی تھے، انھوں نے عیسائی دین کو قبول کرلیا اور اسی عیسائیت بہت ہی مومن اور معتقد بھی ہیں ان لوگوں نے کون سی غلطی یا گناہ کیا ہے کہ مستحق عذاب ہوں اور جہنم میں جائیں؟ اس مسئلہ کو بھی دیکھنا ہوگا شیعوں کے درمیان بھی بہت سے ایسے لوگ ہیں جو کہ گناہان کبیرہ کو انجام دیتے ہیں اور فسق وفجور میں مبتلا ہیں اگر چہ ان کا عقیدہ صحیح ہے لیکن برے کام اور غلط عمل کی وجہ سے

ان پر عذاب ہوگا اور وہ جہنم میں جائیں گے؛ اگر حقیقت میں ایسا ہوا تو تھوڑے سے لوگوں کے علاوہ سب کے سب جہنم ہی میں جائیں گے پھر وہ مشہور مثال "علی باقی رہیں گے اور ان کا حوض"، تو پھر قیامت کے دن کون باقی رہے گا؟ جس کو ساقی کوثر جام پلائیں گے؟

اس طرح یہ نفسیاتی مسئلہ جو انسان کی روح اور ذہن کو جھنجھوڑتا ہے اور بہت اذیت دیتا ہے اور وہ اس کو قبول کرنے میں پریشانی محسوس کرتا ہے جس کے سبب وہ سوچتا ہے تمام مذہب والے کیوں نہ حق پر ہوں؟ اور کیوں نہ ان کو بھی نجات حاصل ہو؟ ہم کو یہ بات ماننا چاہئے کہ بارہ امام کو ماننے والے شیعہ بھی حق پر ہیں اور دوسرے مذاہب والے بھی صحیح عقیدے اور حق پر ہیں بلکہ ممکن ہے کہ دوسرے مذاہب والے ہم سے زیادہ نجیب، پاک و پاکیزہ اور اپنے دین پر عمل کرنے والے ہوں اور دینی عقائد میں ان کا عقیدہ ہم سے زیادہ راسخ ہو بہر حال کثرت ادیان کو قبول کرنے اور ان کو حق پر جاننے سے انسان اپنے اندر جو روحی اذیت اور نفسیاتی اضطراب محسوس کرتا ہے اس سے نجات پا سکتا ہے۔

پلورالزم کی پیدائش میں اجتماعی عوامل کا دخل

دوسرا خاص سبب جو لوگوں کے ذہن میں دینی پلورالزم کی فکر کے پیدا ہونے اور اس کی تقویت کا سبب ہے حقیقت میں وہ ایک اجتماعی اور کلی سبب ہے اس کی وضاحت کچھ اس طرح ہے:

ہم پوری تاریخ میں بہت سی جنگوں کو جو کہ گھروں کی بربادی اور ان کے جلنے کا سبب بنتی

ہیں اکثر دیکھا کرتے ہیں جن کا اصل سبب مذہب اور دین ہے اور انسان فقط دین اور فرقے کے اختلاف کی وجہ سے ایک دوسرے سے لڑتا اور جھگڑتا ہے اور قتل وغارت گری کرتا ہے اس کا واضح اور آشکار نمونہ صلیبی جنگ ہے؛ اس کے دوران ہزاروں مسلمان اور عیسائی مارے گئے اور کتنی بربادی ہوئی کس قدر ثروت اور جائیداد تباہ و برباد ہوئی اور بہت سی قوت و طاقت اس جنگ کی وجہ سے ضائع ہوگئی بہت سے امکانات جو کہ انسان کی آبادی اور رفاہ کے لئے استعمال ہوسکتے تھے وہ نیست و نابود ہو گئے، آج بھی ایک ترقی پذیر ملک اور دنیاوی تعبیر میں ہم لوگ جس کو تمدن یافتہ ملک سمجھتے ہیں انگلستان ہے لیکن وہاں پر بھی عیسائیوں کے دو فرقے کاتھولیک اور پروٹسٹوں کے درمیان خونریز جھڑپ ہوا کرتی ہے، یا ہندوستان اور پاکستان اور افریقا کے بعض ممالک ہی میں دیکھ لیجئے اکیسویں صدی کے آغاز میں آج بھی فرقوں اور مذہبوں میں اکثر جنگیں اور قتل وغارت گری ہوتی رہتی ہے اور یہ سب مذہب و فرقہ کی وجہ سے ہے۔ اگر ہم اس مسئلہ کو حل کرنا چاہیں تو بہت ہی آسانی کے ساتھ یہ مسئلہ حل ہوسکتا ہے وہ اس طرح کہ ہم اس بات کا اعتقاد رکھیں کہ اسلام بھی اچھا دین ہے اور مسیحی مذہب بھی اچھا ہے پروٹسٹ اور کاتھولیک دونوں فرقے حق پر ہیں، شیعہ اور سنّی دونوں فرقے صحیح راستے پر ہیں ؛اس طرح سے لڑائی اور جھگڑے کرنے والے انسانی سماج سے خود بہ خود ختم ہو جائیں گے ۔سچ مچ کیا یہ مناسب نہیں ہے آج کا انسان جو کہ تمدن یافتہ ہے وہ دشمنی اور جنگ وجدال نیز قہر وغضب کو برطرف کردے اور اس کے بجائے صلح وصفائی بھائی چارہ میل ومحبت کے ساتھ" ڈگماتزم X اور یقین پرستی کو دور کر کے تمام مذاہب اور ادیان کا احترام کرے اور دوسرے

کے اعتقاد اور نظریہ کو اپنے عقیدہ اور نظریہ کی طرح حق پر جانے؟ دشمنی اور جنگ جاہل اور غیر متمدن افراد کا کام ہے آج کا انسان متمدن اور سمجھدار ہے۔

لہذا نتیجہ اور خلاصہ یہ ہوا کہ سیاسی اسباب کے علاوہ کم سے کم دو سبب عقلی طور پر پلورالزم کے پیدا ہونے میں دخالت رکھتے ہیں۔

ایک نفسیاتی تصوّر کہ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ تمام انسان جہنم میں نہیں جا سکتے اور دوسرا یہ کہ جنگ اور خونریزی سے بچنے کے لئے ہم پلورالزم کو قبول کریں۔لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا جنگ وخونریزی سے بچنے کے لئے صرف یہی ایک راہ حل ہے کہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ مذہبی جنگ اور فرقوں کے اختلاف سے بچیں تو اس بات کے قائل ہوں کہ تمام دین صحیح اور حق پر ہیں؟ اور اگر بے شمار انسانوں کو (جنکا گناہ کچھ بھی نہیں صرف بعض اجتماعی مسائل اور ان جیسے اختلاف کے سبب انھوں نے راہ حق کو جو کہ ہماری نظر میں اسلام ہے نہیں پہچانا ہے) جہنم میں جانے سے بچائیں تو کیا اس کا واحد راہ حل صرف اور صرف یہ ہے کہ ہم اس بات کے قائل ہو جائیں کہ ہندوؤں کا بت پرست ہونا، مسیحیوں کا تثلیث یعنی تین خدا کا قائل ہونا مسلمانوں کا توحید و یکتا پرست ہونا؛ یہ سب کا سب صحیح عقیدہ ہے؟ اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے؟

پلورالزم کے تصور میں نفسیاتی عوامل کا تجزیہ

نفسیاتی سبب کے جواب میں ہم کہیں گے کہ یہ نظریہ رکھنا کہ شیعہ اثنا عشری مذہب کے علاوہ دوسرے مذہب کے ماننے والے تمام افراد جہنمی ہیں، ایسا نظریہ صحیح نہیں ہے اسلام ایسی کوئی بات نہیں کہتا ہے۔ ہمارا یہ کہنا صحیح ہے کہ حق مذہب صرف ایک ہی ہے لیکن جہنمی ہونا اورعذاب کا مستحق ہونا صرف ان لوگوں سے وابستہ ہے جو اہل عناد ہیں یعنی باوجودیکہ حق ان پر روشن ہو چکا ہے لیکن باطل اغراض کی وجہ سے یا دشمنی کے سبب وہ حق کو قبول نہیں کرتے ہیں، اوراگر کوئی کسی وجہ سے حق کو پہچان نہیں سکا ہے وہ ایسا نہیں ہے یعنی وہ جہنمی اور عذاب کا مستحق نہیں ہے، اس مسئلہ کی بنیاد مستضعف فکری اور جاہل قاصر اور جاہل مقصّر سے متعلق ہے جو کہ ایک فقہی اور کلامی بحث ہے، اسکی مختصر توضیح اور وضاحت اس طرح سے ہے:

مستضعف کا لفظ کبھی ان لوگوں پر بولا جاتا ہے جو کہ اجتماعی اعتبار سے ظالم وجابر حاکموں کے زیر سایہ زندگی بسر کرتے ہیں اور اپنے حق وحقوق سے محروم ہیں؛ لیکن مستضعف کیا یک دوسری اصطلاح علم کلام سے مربوط ہے کہ مستضعف اس شخص کو کہتے ہیں جو معرفت وشناخت کی کمزوری کے باعث صحیح اورحق راستہ تک پہونچنے سے محروم ہے؛ معرفت اور شناخت کی کمزوری کے بھی کئی عوامل اور اسباب ہو سکتے ہیں مثلاً اسلام کے بارے میں اسے بتایا نہ گیا ہو یا اس نے اسلام کے بارے میں کچھ سنا ہی نہ ہو، یا اسلام کے بارے میں اسے بتایا گیا ہو لیکن معرفت کی قوتیں کمزور ہونے کے سبب وہ ادلہ کو سمجھنے سے عاجز رہا ہو، یا یہ کہ دلیلوں کو

سمجھتا ہولیکن ایسے ماحول میں زندگی بسر کر رہا ہے کہ ان دلیلوں کے مقابل اس کے شبہات اوراشکالات وارد کرتے ہوں؛ جن کا اس کے پاس جواب نہیں ہے، یا اس کے حل کے لئے کسی کے پاس رجوع بھی نہیں کرسکتا ہے، یا اس کے علاوہ اور دوسرے عوامل واسباب بھی ہو سکتے ہیں۔

اسی طرح جہل کبھی جہل تقصیری ہوتا ہے اور کبھی جہل قصوری ہوتا ہے اور فطری اعتبار سے جاہل بھی دو قسم کے ہوتے ہیں جاہل مقصّر اور جاہل قاصر؛ جاہل مقصّر اس کو کہتے ہیں کہ جس کے پاس تمام امکانات ہوں، منجملہ ان کے رشد فکری قدرت علمی ※ اجتماعی آزادی ※ اور اطلاعات تک دسترسی وغیرہ، ان سب کے فراہم ہونے کے باوجود اس شخص نے کوتاہی اور سستی کی اور حق کی شناخت کے لئے تحقیق ومطالعہ نہیں کیا جس کے نتیجہ میں حق کو اس نے نہیں پہچانا، جب کہ جاہل قاصر وہ ہے جس کے سامنے حق تک پہونچنے کے سارے راستے بند ہوں اور حقیقت کی تشخیص اس کے لئے ممکن نہ ہو اس طرح حقیقت میں ہمارے سامنے تین قسم کے افراد ہیں:

(۱) وہ لوگ جو حق کو پہچانتے ہیں لیکن دشمنی اور تعصب یا اور دوسرے اسباب کی وجہ سے اس کو قبول نہیں کرتے۔

(۲) وہ لوگ ہیں جن کے پاس تمام امکانات حق کو پہچاننے کے لئے موجود ہیں؛ لیکن وہ لوگ حق کو نہیں پہچانتے ہیں۔

(۳) وہ لوگ ہیں جو حق کو نہیں پہچانتے ہیں اور اس تک پہونچنے اور اس کو پہچاننے کے لئے

ان کے پاس کوئی ذریعہ اور وسیلہ بھی نہیں ہے۔

اسلامی احکام اور معارف کے اعتبار سے جو چیز مسلّم ہے وہ یہ کہ پہلا گروہ عذاب کا مستحق ہے اور وہی ہمیشہ جہنم میں رہے گا، جاہل مقصر نے جتنی تقصیر اور غلطی کی ہے اتنا ہی اس پر عذاب ہوگا؛ ممکن ہے کہ اس پر ہمیشہ عذاب نہ ہو اور وہ ہمیشہ جہنم میں نہ رہے اس کے برخلاف جاہل قاصر کہ فکری مستضعف بھی جاہل قاصر شمار ہوتا ہے اس کے ساتھ قیامت کے دن وہ خاص برتاؤ ہوگا جو بعض احادیث میں وارد ہوا ہے کہ ایسا نہیں ہے کہ اس کو سیدھے اور بغیر کسی مقدمہ کے جہنم میں ڈال دیا جائے۔ اس بنا پر یہ عقیدہ کہ" دنیا میں فقط ایک ہی دین حق ہے" اس کا لازمہ یہ نہیں ہے کہ" دنیا کی اکثریت جہنّمی ہے

پلورالزم کے تصوّر میں اجتماعی عوامل کا تجزیہ

دوسرا سبب جو ذکر ہوا تھا وہ یہ کہ دنیا میں جو لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں ان کا سبب دین اور فرقے کا اختلاف ہے اس ذیل میں ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم بھی اس بات کا اعتقاد رکھتے ہیں کہ مختلف ادیان و مذاہب اور فرقوں کے ماننے والوں کو مذہبی اور عقیدتی اختلاف کی وجہ سے لڑائی جھگڑا نہیں کرنا چاہئے ؛ بلکہ مل جل کر ایک دوسرے کے ساتھ زندگی بسر کرنی چاہیے ۔لیکن اس کا راہ حل صرف یہ نہیں ہے کہ ہم اس بات کے قائل ہوجائیں کہ تمام دین حق پر ہیں بلکہ اور دوسرے راستے بھی پائے جاتے ہیں جن کو دین اسلام نے اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے پیش کیا ہے ؛ اسلام نے خود سب سے پہلے مسلمانوں اور دوسرے ادیان کے ماننے

والوں کو دعوت دی ہے کہ وہ اپنے عقیدوں سے متعلق ایک دوسرے سے علمی اور منطقی گفتگو کریں؛ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے" وجادلھم بالتی ھی احسن" (۱) یعنی ان لوگوں سے اچھی روش اور بہتر طریقے سے بحث وجدال کرو۔

دوسرے یہ کہ غیر مسلموں کے ساتھ کیسا سلوک کرنا چاہئے اوران سے کیسے

....

(۱) سورہ نحل:۱۲۵۔

ملنا چاہئے اس کے لئے بھی اس نے مسلمانوں کو چند گروہ میں تقسیم کیا ہے:

(الف) آسمانی اور توحیدی ادیان کے ماننے والے

بعض ادیان کے ماننے والوں کی بہ نسبت جیسے مسیحی یہودی زرتشت وغیرہ اگر چہ ان دینوں میں تحریف کر دی گئی ہے؛ لیکن انکی اصل و بنیاد صحیح ہے اسلام نے ان کے مقابلہ میں ایک خاص طریقہ اختیار کیا ہے اوران لوگوں کے ساتھ اچھے سلوک کرنے کا حکم دیا ہے؛ اورانکے جان و مال اور ناموس محترم ہیں ان لوگوں کو اجازت ہے کہ یہ لوگ اسلامی معاشرہ میں اپنے کلیسا اور عبادت خانہ بنا کر عبادت کریں نکاح طلاق اور دوسرے معاملات کو اپنی شریعت اور دین کے مطابق انجام دیں اور مالیات جو اسلام نے مسلمانوں کے لئے خمس وزکات کی صورت میں رکھا ہے؛ ان کے لئے ان کے عوض میں خاص مالیات رکھا ہے جس کو جزیہ اور مالیات کہتے ہیں؛ اس کے مقابلہ میں اسلام نے ان کی جان و مال اورعزت وآبرو کا حکم دیا

ہے اور تمام ضروری اجتماعی خدمات کو ان کے لئے قرار دیا ہے اور یہ لوگ بہت سے حقوق میں مسلمانوں کے برابر ہیں اور مسلمانوں سے کوئی فرق نہیں رکھتے ہیں؛ ہم نے یہ واقعہ سنا ہے کہ اسلام کے بے مثل و بے نظیر رہبر اسلامی عدالت کو پھیلانے والے حضرت علی نے جب یہ سنا کہ ایک غیر مسلم پر ظلم و ستم ہوا ہے تو آپ نے اس کی مذمت کی جس وقت معاویہ کی فوج کے ایک سپاہی نے ایک غیر مسلم عورت کے پیروں سے پا زیب چھین لیا تو آپ نے اس کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا: "اگر کوئی مسلمان شخص اس قضیہ پر افسوس کرتے ہوئے مر جائے تو مناسب ہے اور اس پر کوئی ملامت نہیں ہے"

(ب) کفّار معاہد

غیر مسلموں کافروں کی ایک دوسری جماعت ہے جو دین توحیدی کے قائل نہیں ہیں لیکن وہ اسلامی حکومت سے معاہدہ اور معاملہ رکھتے ہیں؛ اس کی وجہ سے وہ مسلمانوں کے ساتھ زندگی بسر کر سکتے ہیں اور مسلمانوں کے پڑوس حتیٰ اسلامی معاشرہ کے اندر اور مسلمانوں کے درمیان بھی رہ سکتے ہیں، عرف عام میں ایسے لوگوں کو کفّار معاہد کہا جاتا ہے اگر چہ ان کے رہنے کے شرائط اور حقوق ایک جیسے نہیں ہیں بلکہ جیسا معاملہ حکومت اسلامی کے ساتھ ہوتا ہے اس کے اعتبار سے فرق رکھتے ہیں؛ لیکن بہر حال اسلام نے غیر مسلموں کے اس گروہ کے ساتھ اچھا سلوک کیا ہے اور اسلامی حکومت میں ان کی جان و مال اور عزت و آبرو محفوظ ہے۔

(ج) کفّار اہل حرب

غیر مسلموں کا تیسرا گروہ ہے یہ وہ لوگ ہیں جو کہ مشہور قول کی بنا پر کسی طرح بھی سیدھے راستے پر نہیں ہیں اور کسی بھی صلح و معاہدہ کے لئے تیار نہیں ہوتے ہیں؛ یا اگر کوئی معاہدہ وغیرہ کرتے ہیں تو اس کو توڑ دیتے ہیں ارشاد خداوند عالم ہو رہا ہے:

"لا یرقبون فیکم الاّ ولا ذمۃ" (۱) یعنی آپ کے بارے میں نہ تو اپنائیت کو اختیار کرتے ہیں اور نہ ہی کسی معاہدہ کی رعایت کرتے ہیں

اسلام اس گروہ کے بارے میں کہتا ہیکہ اگر یہ کسی بھی طرح بات چیت اور مناظرہ کے لئے حاضر نہیں ہیں اور کسی بھی معاہدہ اور اتفاق پر راضی نہیں ہیں تو ان سے جنگ کرو اور ان کو زبر دستی مجبور کرو کہ وہ تمھارے تابع ہو جائیں؛ لیکن اس مقام پر بھی اسلام یہ نہیں کہتا کہ ان کو مار ڈالو اور ان کی نسل کو ختم کر ڈالو بلکہ جنگ اس وقت تک ہو کہ یہ لوگ قبول کر لیں یا سیدھے راستے پر آ جائیں اور فتنہ پھیلانے سے باز آ جائیں۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام غیر مسلموں سے رابطہ کے متعلق پہلے تو ان کو بحث و مناظرہ کی دعوت دیتا ہے تا کہ اس منطقی اور استدلالی طریقے سے حقیقت کو سمجھ لیں اور معلوم ہو جائے کہ حق کس کے ساتھ ہے، اور دوسرے مرحلہ میں بھی اگر وہ لوگ حق کو قبول نہیں کرنا چاہتے تو بھی فردی یا اجتماعی صورت میں ان سے جنگ و جدال نہیں کرتا بلکہ صلح و صفائی کے ساتھ رہنے کی دعوت دیتا ہے۔

.... (۱) سورہ توبہ: آیہ ۸۔

غیر مسلموں کے ساتھ اسلام کے سلوک کا ایک تاریخی نمونہ

یہاں پر مناسب ہے کہ اس واقعہ کی جانب اشارہ کرتا چلوں جس میں پیامبر اسلام نے نجران کے عیسائیوں کے ساتھ علمی مناظرہ کیا اور وہ لوگ مغلوب ہو گئے لیکن پھر بھی مسلمان ہونے پر آمادہ نہیں ہوئے تو رسول اکرم کو خدا کی طرف سے حکم ہوا کہ ان کو مباہلہ کی دعوت دیں اور یہ طے ہوا کہ دوسرے دن وہ لوگ کسی معین اور مخصوص جگہ پر حاضر ہوں اور ایک دوسرے سے مباہلہ کریں تاکہ جو شخص باطل پر ہے اس پر خدا کی لعنت ہو اور اس پر اللہ کا عذاب نازل ہو۔ نجران کے عیسائیوں نے پہلے تو مباہلہ کو قبول کیا لیکن جب دوسرے دن مباہلہ کرنے آئے تو دیکھا کہ رسول اپنے ساتھ اپنے سب سے زیادہ محبوب اور عزیز افراد یعنی بیٹی فاطمہ زہرا، بھائی علی مرتضیٰ اور نواسے حسنین کو لے کر آئے ہیں تو وہ لوگ مباہلہ کرنے سے پیچھے ہٹ گئے اور مباہلہ کے لئے تیار نہیں ہوئے اور اس بات پر معاہدہ ہوا کہ اسلامی حکومت کو جزیہ دیں گے۔

بہر حال ہم دیکھتے ہیں کہ مذہبی جنگ سے بچنے کے لئے فقط یہی راستہ نہیں ہے کہ ہم سارے ادیان اور مذاہب کو حق جان لیں اور اس بات کو قبول کر لیں کہ ان تمام مذاہب میں کوئی فرق نہیں ہے بلکہ اور بھی کئی راستے ہیں اور اسلام نے خود ایک منطقی حل اور ایک بہت ہی اچھا راستہ اس کے لئے پیش کیا ہے۔

اصل بحث کی طرف بازگشت

اب ہم اصل بحث کی طرف پلٹتے ہیں اور پلورالزم کی دلیلوں کی تحلیل وتنقید کرتے ہیں جیسا کہ ہم نے شروع میں بھی اس جانب اشارہ کیا، یہ بات ذہن نشین رہے کہ پلورالزم مختلف چیزوں میں قابل ذکر ہے لیکن فی الحال ہم یہاں پر صرف دینی پلورالزمم سے متعلق بحث و گفتگو کریں گے اور دوسری چیزیں جیسے سیاسی واقتصادی پلورالزم وغیرہ سے بحث نہیں کریں گے اور کیا صحیح یا غلط ہونا اور ان کی کمیت اور کیفیت ہماری گفتگو سے خارج ہے۔ اگر چہ اس زمانے میں دینی پلورالزم کی فکر پیش کرنے والا اور اس کا پرچم اٹھانے والا" جان ہیک" ہیں اور اس کی چند کتابیں اس کے متعلق پائی جاتی ہیں؛ لیکن دینی پلورالزم کی تفسیر کیا ہے اور اس سے کیا مراد ہے؟ کوئی ایک خاص معنی مراد نہیں لیا گیا ہے بلکہ اس کی مختلف طرح سے وضاحت کی گئی ہے؛ کم سے کم تین طرح سے اس کے معنی کو ذکر کیا جاسکتا ہے۔

دینی پلورالزم کی پہلی تفسیر

پہلا بیان اس طرح ہے کہ" تمام ادیان میں حق اور باطل پایا جاتا ہے ان کے درمیان فقط حق یا فقط باطل کا ہونا ناممکن ہے"۔ اس بیان کی وضاحت کچھ اس طرح ہے کہ اگر آپ دنیا کے مختلف ادیان کو دیکھیں گے تو آپ کو مکمل طریقے سے کوئی بھی دین ایسا نہیں ملے گا جو کہ حق یا باطل ہو بہت سی باتیں سب میں مشترک پائی جاتی ہیں بہت سے احکام اور عقیدے

نیز خصوصیات جو ایک دین میں ہیں ممکن ہے وہ دوسرے دین میں بھی حاصل ہوں یعنی دوسرا دین بھی وہی خصوصیات رکھتا ہو مثلاً قرآن مجید میں خدا فرماتا ہے کہ جو چیزیں ہم نے بنی اسرائیل کے لئے قرار دی ہیں وہی تمھارے لئے بھی قرار دی ہیں منجملہ انھیں احکام میں ایک حکم قصاص کا بھی ہے جس کے متعلق وضاحت سے فرمایا ہے یہ وہی حکم ہے جو ہم نے مسیحیوں اور یہودیوں کے لئے قرار دیا تھا۔(۱) اسی طرح آپ بیہودہ عقیدے اور باطل باتیں تمام دین میں دیکھ سکتے ہیں تو اب چاہے اعتقاد کی باتیں ہوں یا احکام یا افکار و اقدار کی باتیں ہوں، ان سب کے اندر دنیا میں بہت سے حق پائے جاتے ہیں لیکن ان کا مجموعہ ایک جگہ نہیں ملے گا؛

....

(۱) ملاحظہ ہو سورہ مائدہ: آیہ ٤٥ تا ٤٨۔

بلکہ ہر دین میں حقیقت کا کچھ حصہ پایا جاتا ہے لہٰذا یہ لازم نہیں ہے کہ آپ صرف ایک خاص دین کا اعتقاد رکھیں بلکہ ممکن ہے کہ آپ یہودی بھی رہیں، مسیحی بھی، مسلمان بھی یا کسی اور مذہب سے بھی تعلق رکھتے ہوں اس طرح کہ جس دین میں جو اچھا عنصر پایا جاتا ہو آپ اس کو اختیار کر لیں؛ یہاں تک کی بودھ مذہب جو کہ خدا کے وجود کا منکر ہے اس کے اندر بھی بعض اچھے عناصر ہیں جیسے سکون روح، یکسوئی، دنیا سے دوری وغیرہ آپ ان کو اختیار کر لیں البتہ یہ بیان ایک افراطی رجحان رکھتا ہے جو یہ کہتا ہے کہ تمام ادیان میں حق و باطل کی آمیزش اس حد تک موجود ہے کہ ایک کو دوسرے سے بہتر نہیں کہا جا سکتا؛ بلکہ وہ سب ایک ہی

جیسے ہیں ان میں ایک معتدل نظریہ یہ ہے کہ اگر چہ حق و باطل کا وجود تمام ادیان میں ہے لیکن حق و باطل کی مقدار ایک طرح نہیں ہے یعنی نسبی اعتبار سے تفاوت ہے جس کے ذریعہ ایک کو دوسرے پر فوقیت دی جاسکتی ہے، لیکن پھر بھی مطلق فوقیت نہیں پائی جاتی بلکہ تمام ادیان میں اچھائیاں اور برائیاں دوونوں ہی پائی جاتی ہیں۔

دینی پلورالزم کی پہلی تفسیر کا تجزیہ

اس بیان کے جواب میں سب سے پہلے ہم یہ کہیں گے کہ ہر انصاف پسند شخص اگر تھوڑی سی بھی عقل اور ادیان سے متعلق سطحی معلومات بھی رکھتا ہوگا تو وہ اس بات کی تصدیق کرے گا کہ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ادیان کے درمیان ایک دوسرے پر کوئی ترجیح نہیں ہے اور سب کے سب برابر ہیں، بعض دین ایسے بھی ہیں کہ ان کے اندر ایسی باتیں پائی جاتی ہیں کہ زبان و قلم ان کے بیان کرنے اور لکھنے سے شرم محسوس کرتے ہیں کیا سچ مچ جانور، گائے اور کتّے کو پوجنا خدا پرستی کے برابر ہوسکتا ہے؟ کیا بت پرستوں کا وہ یقین و اعتقاد جو کہ ہندوستان کے بعض لوگوں میں ہے اور وہ آلہ تناسل کی پرستش کرتے ہیں اور اس کے سامنے زمین پر جھکتے ہیں اور بہت سے لا ولد افراد اپنے مرض کے علاج کے لئے اس پر پانی ڈال کر تبرکاً پیتے یا استعمال کرتے ہیں اس کا مقائسہ مذہب اسلام (جو کہ نجات دینے والا ہے اور اس کے اندر تمام کمالات اور لا تعداد اچھائیاں پائی جاتی ہیں اور جو خدائے وحدہ لاشریک کی عبادت کا حکم دیتا ہے) سے کیا جاسکتا ہے اور ان دونوں مذہب کو ایک فہرست میں شمار کیا جاسکتا ہے؟

بہر حال ہماری نظر میں یہ بات بہت ہی واضح ہے کہ تمام ادیان کو جیسا ایک قرار دینا اور سبھی کی خصوصیات اور اوصاف کو ایک جیسا قرار دینا اور ان میں سے کسی ایک کو بھی منتخب کر لینا یہ ایسی باتیں ہیں جن کو کوئی بھی عقلمند انسان قبول نہیں کر سکتا ہے

دوسرے خاص کر ہمارے نظریہ میں کہ ہم مسلمان ہیں اور قرآن و اسلام کا اعتقاد رکھتے ہیں یہ مطلب کسی بھی طرح قابل قبول نہیں ہے ہمارے لئے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ہم قرآن کی بعض باتوں کو قبول کریں اور بعض کا انکار کریں اگر ہم نے بعض کا انکار کیا تو گویا سبھی کا انکار کیا اور قرآن کے بعض مطالب کا انکار کر کے کوئی بھی اپنے آپ کو مسلمان نہیں کہہ سکتا ہے۔ قرآن اس بارے میں واضح طور سے فرماتا ہے: افتومنون ببعض الکتاب ۔۔۔(۱) کیا تم لوگ قرآن کے بعض پر ایمان لاتے ہو اور بعض کا انکار کرتے ہو پس جو ایسا کرتا ہے وہ دنیا میں ذلت کے علاوہ کچھ بھی نہیں پائے گا اور قیامت کے روز سخت ترین عذاب دیکھے گا ۔دوسری جگہ ارشاد ہو رہا ہے: جو لوگ چاہتے ہیں کہ خدا اور اس کے رسول کے درمیان جدائی ڈالیں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لائے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اصل میں یہی لوگ کافر ہیں (۲) بہر حال ہم مسلمانوں کی نظر میں اسلام اور قرآن کے عنوان سے جو کچھ بھی اور نبی کی جانب سے لوگوں تک پہونچایا گیا ہے وہ سب کا سب صحیح اور حق ہے

....

(۱) سورہ بقرہ: آیت ۸۵۔

(۲) سورہ نساء: آیت ۱۵۔

اوراس میں کچھ بھی باطل نہیں ہے وانّہ لکتاب عزیز لا یاتیہ........۔(۱) بے شک یہ کتاب عالی مرتبہ ہے جس کے قریب سامنے یا پیچھے کسی طرف سے بھی باطل نہیں آ سکتا ہے۔

البتہ ان کا یہ کہنا کہ تمام ادیان میں حق کا عنصر پایا جاتا ہے ہم اس کو قبول کرتے ہیں اور یہ بات کوئی مشکل بھی نہیں ہے مثلاً زرتشتیوں کا یہ مشہور مقولہ ہے نیک بات نیک سوچ نیک کردار یہ ایک اچھا مقولہ ہے اورکوئی بھی اس سے انکارنہیں کرسکتا ہے خاص کر یہودی مسیحی اور زرتشتی کہ خدائی اصل رکھتے ہیں، اگر چہ ہمارے عقیدے کے مطابق ان ادیان میں تحریف اور کمی و بیشی ہوئی ہے لیکن پھر بھی حق اور صحیح عناصر اس میں پائے جاتے ہیں لیکن پھر بھی یہ بات ذہن میں رہے کہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم اس بات کو قبول کرلیں کہ اسلام بھی دوسرے مذاہب کی طرح حق وباطل کا مجموعہ ہے اور ہم اس بات کے قائل ہو جائیں مسلمان ہو یا یہودی یا مسیحی اور زرتشتی سب کے سب برابر ہیں بلکہ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا ہمارے عقیدے کے مطابق وہ مذہب اسلام جس کو خداوندعالم نے پیامبر اکرم کے ذریعہ بھیجا وہ پورا کا پورا حق ہے اوراس میں کچھ بھی باطل نہیں ہے۔

....

(۱) سورہ فصّلت: آیہ ۴۱ و ۴۲

دینی پلورالزم کی دوسری تفسیر

دوسرا بیان جو کہ دینی پلورالزم کو واضح کرتا ہے وہ یہ ہے کہ" تمام ادیان اوران کے راستے ایک ہی حقیقت کی طرف پہونچ کرمنتہی ہوتے ہیں"۔

پہلا بیان یہ تھا کہ مختلف ادیان کے درمیان حقائق بٹے ہوئے ہیں اور ہر دین حقیقت کے کچھ حصّوں پر مشتمل ہے لیکن یہ بیان اس سے ہٹ کر اس چیز کو بتاتا ہے کہ حقیقت صرف ایک ہے؛ اور بہت سے راستے اس تک پہونچتے ہیں جو مختلف ادیان کی شکل میں پائے جاتے ہیں اس کی مثال اس طرح ہے مثلاً تہران تک پہونچنے کے لئے بہت سے راستے پائے جاتے ہیں اور لوگ مختلف راستوں سے تہران میں داخل ہو سکتے ہیں شمال، جنوب، مشرق اور مغرب غرض کہ تہران جانے کے لئے ہر طرف سے راستہ ہے جس کو ہر انسان چاہتا ہے وہ صرف ایک ہے لیکن مختلف راستوں سے جیسے اسلام ،مسیحیت ، یہودیت ، بودھ ازم، اور مختلف ادیان اس حقیقت تک پہونچا جا سکتا ہے۔

یہ بیان بھی پہلے بیان کی طرح دو طرح کا افراطی اور اعتدالی رجحان رکھتا ہے جو لوگ افراطی (شدت پسند) اس بات کا اعتقاد رکھتے ہیں کہ یہ تمام راستے کیفیت اور کمیت کے اعتبار سے برابر ہیں اور ان میں کوئی بھی فرق نہیں ہے۔ اعتدالی رجحان اس بات کا قائل ہے کہ اگر چہ راستے مختلف ہیں اور ایک حقیقت کی طرف لے جاتے ہیں لیکن مختلف راستوں میں دوری اور نزدیکی پائی جاتی اور کچھ پیچ وخم بھی رکھتے ہیں اور ان کے درمیان کمی اور زیادتی پائی جاتی ہے ایک راستہ بہت لمبا ہے تو ایک بہت چھوٹا ہے ایک بالکل سیدھا ہے تا دوسرا ٹیڑھا ہے؛ مثلاً اسلام مسیحیت کی نسبت سیدھا اور بہت کم فاصلہ رکھتا ہے لیکن اگر کوئی مسیحیت اور اس کے دستورات واحکام پر عمل کرتا ہو اور اعتقاد رکھتا ہو تو وہ بھی حقیقت تک پہونچ سکتا ہے۔

اس دوسرے بیان کو بھی ثابت کرنے کے لئے کبھی شعراء کے اشعار اور کبھی عرفاء کی مثالوں کا سہارا لیا جاتا ہے مثلاً شیخ بہائی کا یہ شعر پیش کیا جاتا ہے:

هر جا که روم پر تو کاشانه تو ئی تو
هر در که زدم صاحب آنخانه تو ئی تو
در میکده و دیر که جانانه تو ئی تو
مقصود من از کعبه و بتخانه تو ئی تو

مقصود توئی کعبه و بت خانه بهانه

یعنی میں جس جگہ بھی جاتا ہوں وہاں تیرا ہی جلوہ نظر آتا ہے جس گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہوں اس گھر کا مالک تو ہی ہے، بت خانہ اور میکدہ کے اندر محبوب تو ہی ہے کعبہ اور بت خانہ سے میری مراد تو ہی ہے؛ کعبہ اور بت خانہ تو ایک بہانہ ہے ورنہ حقیقت میں میرا مقصود تو ہی ہے خلاصہ یہ کہ اگر فکر و نظر کے پردہ کو چاک کیا جائے تو مسجد، بت خانہ، گرجا گھر اور میکدہ ہر جگہ رخ محبوب کی تصویر دکھائی دیگی" عباراتنا شتّٰی وحسنک واحد" یعنی عبارتیں الگ الگ ہیں لیکن حسن سب کا ایک ہی ہے یعنی اگر چہ کلام سب کا الگ الگ ہے لیکن سب کے سب ایک ہی رخ زیبا کی تعریف کررہے ہیں۔

دینی پلورالزم کی دوسری تفسیر کا تجزیہ

کیا یہ بیان قابل قبول ہے اور اس کو سند قرار دیتے ہوئے ہم دینی پلورالزم کو قبول کرلیں؟ جو کہ یہ کہتے ہیں کہ اسلام ہو یا مسیحیت یا یہودیت وزرتشتی سب کے سب ایک ہی حقیقت اور سب کے سب انسان کو نیکی وکمال کی طرف پہونچاتے ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ تصوّر اور ثبوت کے مرحلہ میں ایسا فرض کرنا ممکن ہے، مثلاً ایک ایسے دائرہ کو فرض کیجئے کہ جس کے چاروں طرف سے مختلف شعائیں اس کے مرکز تک پہونچتی ہوں اور تمام شعاعیں ایک ہی نقطہ پر ختم ہوتی ہوں، لیکن کیا موجودہ ادیان کے بارے میں بھی ایسا کہا جاسکتا ہے کہ وہ اسی طرح ہیں جیسا ان کا وہم وخیال ہے؟ تھوڑی سی بھی دقت اور توجہ کی جائے تو معلوم ہوجائیگا کہ ایسا نہیں ہے (اور مختلف ادیان میں کوئی بھی یکسانیت نہیں ہے)۔سب سے پہلا مسئلہ جو کہ اسلام میں ہے وہ توحید اور خدا کو یکتا قبول کرنے کا ہے اسلام کی سب سے پہلی آواز ہے: قولوا لا الٰہ الاّ اللّٰہ تفلحوا تم لوگ کہو کہ خدا ایک ہے تا کہ کامیاب ہوجاؤ!

لیکن مسیحیت کا نظریہ اس مسئلہ توحید میں کچھ اور ہے جس کی حکایت خداوند عالم یوں کر رہا ہے" انّ اللّٰہ ثالث ثلاثۃ" یقیناً خدا تین میں سے ایک ہے، یعنی ان کے یہاں تین خدا ہیں ؛ایک باپ کہ خدائے اصلی کہ جس کو خدائے اب کہتے ہیں، ایک بیٹا کہ جو خدائے ابن ہے، اور تیسرا خدا روح القدس ہے۔بعض عیسائی قائل ہیں کہ تیسرا خدا حضرت مریم ہیں۔

یہ اعتقاد جس کو تثلیث کے نام سے جانا جاتا ہے یہ ایسا اعتقاد ہے جس کی خدا نے سختی کے ساتھ ممانعت کی ہے اور اس کو رد کیا ہے اس بات سے لوگوں کو روکا ہے اور اس کے ماننے والوں کو کافر کہا ہے،

قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:" لقد کفر الذین قالوانّ اللہ۔۔" (۱) جو لوگ کہتے ہیں کہ اللہ تین میں کا تیسرا ہے یقیناً وہ لوگ کافر ہیں اور اللہ کے علاوہ کوئی بھی خدا نہیں ہے؛ اگر یہ لوگ اپنے قول سے باز نہیں آئینگے تو ان میں سے کفر اختیار کرنے والوں پر دردناک عذاب ہوگا۔

مسیحیوں کے اس عقیدے کو (جو وہ لوگ حضرت عیسیٰ کے بارے میں رکھتے ہیں یعنی ان کو خدا کا بیٹا سمجھتے ہیں) خدا نے بہت ہی عجیب جانا ہے، قرآن کریم میں ارشاد ہورہا ہے :" وقالوااتخذ الرحمٰن ولداً۔۔" (۲) اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ رحمٰن نے ایک فرزند بنا لیا ہے یقیناً تم لوگوں نے بہت سخت بات کہی ہے قریب ہے کہ اس سے آسمان پھٹ پڑے اور زمین شگافتہ ہوجائے اور پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہوکر گر پڑیں؛

....

(۱) سورہ مائدہ: آیہ ۷۳۔

(۲) سورہ مریم: آیہ ۸۸ تا ۹۰۔

سچ مچ قرآن کی یہ تعبیر کتنی سخت ہے؟ تثلیث کا اعتقاد اور یہ کہ عیسی خدا کے بیٹے ہیں اس حد تک غلط ہے اور بربادی کا سبب ہے کہ اس کے اثر سے قریب ہے کہ تمام آسمان اور زمین نیز پہاڑ تباہ و برباد ہوجائیں۔ کیا اس طرح کی تعبیر کے بعد بھی یہ کہنا صحیح ہے کہ تثلیث کا اعتقاد اور

توحید کا اعتقاد دونوں ایک حقیقت کی طرف لے جانے والے ہیں! ایک مذہب اسلام ہے جو کہتا ہے کہ سور کا گوشت کھانا حرام اور نجس ہے اور دوسرے مذاہب یہ کہتے ہیں کہ سور کا گوشت لذیذ اور اچھا ہے اور اس کا کھانا جائز ہے؛ اسلام کہتا ہے کہ شراب اور الکحل نہایت بری چیز ہے اور شیطانی پھندے ہیں جب کہ مسیحیت کہتی ہے کہ بعض شراب کے کچھ حصہ میں خدا کا خون ہوتی ہے، کشیش (عیسائی عالم) لوگ عشائے ربّانی کے مراسم میں روٹی کے ٹکڑے کو شراب میں ڈبوتے ہیں پھر سب منھ میں ڈالتے اور کہتے ہیں کہ شراب جب انسان کے خون میں جاتی ہے تو خدا کا خون بن جاتی ہے؛ عاقل اور بالغ انسان کو جانے دیجئے ایک معمولی بچہ بھی اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ یہ دو دین اس حالت میں کسی بھی صورت میں ایک نقطہ اور منزل پر نہیں پہونچ سکتے؛ آپ خود دیکھیں ایک مذہب کہتا ہے کہ جب تک شراب نہیں پیوگے تم خدا کے ماننے والے نہیں ہو سکتے ہو جب کہ دوسرا مذہب یہ کہتا ہے کہ شراب پینا شیطانی عمل ہے؛ اب اس کے بعد بھی ہم کہیں کہ دونوں مذہب ایک مقصد تک لے جاتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ ایک احمقانہ بات ہے اور افسانہ وشعر سے مشابہ ہے نہ کہ واقعیت اور حقیقت سے؛ مگر یہ کہ خدا اور شیطان کو بھی ایک جانیں اور کہیں کہ "کعبہ اور بت خانہ سے مراد فقط تو ہی ہے"

سچ مچ یہ بہت ہی تعجب اور حیرت کی بات ہے کہ بہت سے لوگ اس کے باوجود "بہت سے سیدھے راستوں" کے قول پر اصرار کرتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ یہ سب اختلاف اور تعارض جو ادیان میں پایا جاتا ہے ان سب کا نتیجہ ایک ہی ہے؛ یعنی سب کے سب آخر میں ایک

مقصد تک پہونچتے ہیں؛ آخر یہ کیسے ممکن ہے اسلام کا نظریہ کہ "خدا موجود ہے" اور بودھ ازم کا نظریہ یہ کہ "کوئی بھی خدا موجود نہیں ہے" اور پھر بھی دونوں ایک حقیقت تک پہونچتے ہوں؟! یہ کیسے ہوسکتا ہے حضرت علی کو بھی مانا جائے اور معاویہ کو بھی؛ حضرت امام حسین کو بھی قبول کریں اور یزید و شمر ذی الجوشن کو بھی؟! اور یہ اعتقاد رکھیں کہ سب کے سب حق پر ہیں اور جس کے پیچھے بھی چلا جائے وہ سیدھا راستہ ایک ہے اور منزل مقصود تک پہونچانے والا ہے؟ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ایک پورب کو جاتا ہے اور ایک پچھّم کو، ایک اتر کو جاتا ہے اور دوسرا دکھن کو، اور ہر ایک کا الگ الگ راستہ ہے اور پھر بھی اسی بات پر اصرار ہے کہ سب کے سب سیدھے راستے پر ہیں اور ایک حقیقت کی طرف لے جاتے ہیں۔

شعر:

ترسم نه رسی به کعبه ای اعرابی

این ره که تو می روی به ترکستان است

اے اعرابی! میں ڈرتا ہوں کہ تو کعبہ کو نہیں پہونچے گا اس لئے کہ جس راستے پر تو جا رہا ہے وہ راستہ ترکستان کو جاتا ہے۔

بہر حال پلورالزم دینی کی یہ دوسری تفسیر جس کا مطلب یہ ہے کہ تمام ادیان اور مذاہب ہم کو ایک منزل مقصود تک لے جاتے ہیں اگر چہ اشعار کے لحاظ سے ایک اچھی چیز ہے ہے لیکن حقیقت اور واقعیت سے خالی ہے اور اس کا باطل ہونا سورج سے بھی زیادہ روشن ہے۔

دینی پلورالزم کی تیسری تفسیر

تیسرا بیان جو دینی پلورالزم کے لئے کیا جاتا ہے وہ اصل میں ایک معرفت شناسی پر منحصر ہے اس بنیاد پر وہ تمام چیزیں جو کہ غیر حسیّ اور غیر تجربی ہیں یعنی ان کو محسوس نہیں کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی ان کا تجربہ کیا جا سکتا ہے؛ وہ بے معنی ہیں اور نفی اثبات کے لائق نہیں ہے اگر چہ اس کی تفصیل معرفتی شناخت سے مربوط ہے لیکن اس کی مختصر وضاحت یہاں پر کی جا رہی ہے:

معرفت شناسی کی بحث میں بعض (پوزیٹیوسٹ) کہتے ہیں کہ جو پہچان اور معرفت والی چیزیں ہیں وہ دو حصّوں میں منقسم ہوتی ہیں

پہلی قسم میں وہ چیزیں ہیں جو کہ محسوس کی جا سکتی ہیں اور ان کو دیکھا جا سکتا ہے جیسے ہم کہیں کہ چراغ روشن ہے یہ بات تجربہ اور محسوس کرنے کے قابل ہے آپ بٹن کو دبائیں گے تو پورا کمرہ تاریک ہو جائیگا اور کچھ بھی دکھائی نہیں دے گا پھر آپ بٹن کو دبائیں گے تو پورا کمرہ جگمگا اٹھّے گا اور آپ جس چیز کو بھی دیکھنا چاہیں دیکھ سکتے ہیں، یا جب ہم یہ کہتے ہیں کہ آگ جلاتی ہے تو یہ تجربہ کرنے والی چیز ہے؛ اور اس کو محسوس کیا جا سکتا ہے؛ اگر آپ اپنے ہاتھ کو آگ کے قریب لے جائیں گے تو ہاتھ جل جائے گا۔ اس طرح کی چیزیں جو تجربہ کی جا سکتی ہیں اور ان کو محسوس کیا جا سکتا ہے تو ان کے متعلق یہ کہنا صحیح ہے کہ یہ سچ ہے یا یہ جھوٹ؟ حق ہے یا باطل؟ صحیح ہیں یا غلط؟ کیونکہ معلوم کرنے کا راستہ یہی حس اور تجربہ ہے۔

دوسری قسم میں وہ چیزیں ہیں جو کہ حس اور تجربے میں نہیں آسکتی ہیں یا وہ تجربے کے لائق

نہیں ہیں ان چیزوں کا اقرار یا انکار نہیں کیا جا سکتا ہے؛ یا وہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ ایسی چیزیں کچھ معنیٰ نہیں رکھتی ہیں، اوران میں سچ یا جھوٹ نہیں پایا جا تا ہے لہٰذا ایسی چیزوں کے بارے میں کچھ بھی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ جو افراطی (شدّت پسند) پوزیٹوسٹ ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس طرح کی چیزیں اصلاً بے معانی ہیں ان کا ہونا اسی طرح ہے جیسے کہا جائے کہ "اس چراغ کی روشنی کا مزہ کھٹّا ہے" یا یہ کہیں کہ "اس چراغ کا نور انگلینڈ کا بادشاہ ہے" جس طرح یہ دونوں چیزیں بے معنی ہیں اور کچھ مطلب نہیں رکھتی ہیں اسی طرح وہ چیزیں جو کہ تجربہ کے لائق نہیں ہیں اور محسوس نہیں کی جا سکتی ہیں وہ بھی ایسی ہی ہیں؛ دین سے متعلق باتیں بھی یہی حکم رکھتی ہیں مثلاً یہ بات کہ خدا موجود ہے، خدا ایک ہے یا خدا تین ہے یا خدا نہیں ہے یہ سب بھی بے معنی اور بے مفہوم باتیں ہیں کہ ان کے حق یا باطل ہونے یا سچے اور جھوٹے ہونے کا دعویٰ کرنا غلط اور بیکار ہے اور کچھ فرق نہیں پڑتا کہ آپ کس ایک کو مانتے ہیں چاہے آپ یہ کہیں کہ خدا ایک ہے یا یہ کہیں کہ خدا تین ہے دونوں باتیں فائدہ کے اعتبار سے برابر ہیں اور کچھ بھی معنیٰ و مفہوم نہیں رکھتی ہیں، یہ سب باتیں نہ ہی پیٹ کی غذا بنتی ہیں اور نہ ہی جسم کا لباس اور نہ ہی انسانی زندگی کی کسی بھی مشکل کا حل پیش کرتی ہیں۔

لیکن جو پوزیٹیسٹ اعتدال پسند ہیں وہ کہتے ہیں کہ جو چیزیں حس اور تجربہ کے قابل نہیں ہیں ؛جن کو اصطلاح میں ماوراءطبعت کہا جاتا ہے؛اس طرح کی چیزیں بے معنی نہیں ہیں؛ لیکن چونکہ ہماری پہونچ سے باہر ہیں اور ہم ان کو محسوس اور ان کا تجربہ نہیں کر سکتے لہٰذا ان کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ثابت ہیں یا نہیں اس نظریہ کا نتیجہ نسبیت اور شکاکیت ہے یعنی

غیر حسی اورغیر تجربی چیزوں کے بارے میں دینی باتوں کا بھی شمار انھیں میں ہوتا ہے، یا یہ کہیں گے کہ ان کے حق یا باطل ہونے کو ہم نہیں جانتے ہیں؛ کیونکہ وہ ہمارے تجربے میں نہیں ہیں، یا یہ کہیں گے کہ ان کا جھوٹ اور سچ ہونا معاشرہ اورزمانے کے اعتبار سے فرق کرتا ہے کبھی کبھی سارے حق بھی ہو سکتے ہیں اور کبھی کبھی سب کے سب باطل بھی ہو سکتے ہیں یہ اس بات پر منحصر ہے کہ ہم ان کو کس شخص، کس زمانہ، کس معاشرہ اور کس ماحول کی نسبت دیکھتے ہیں۔ کبھی یہ کہا گیا ہے کہ افکار واقدار کے مفاہیم یا وہ چیزیں جن میں اچھائی اور برائی ہوسکتی ہے ان میں حق اور باطل نہیں پایا جاتا ہے اور اس طرح کی خبریں جیسے عدالت کے ساتھ انسان کو سلوک کرنا چاہئیے ٭ ظلم نہیں کرنا چاہئیے ٭ سچ کہنا اچھی بات ہے ٭ جھوٹ بولنا بری بات ہے یہ سب باتیں احساس اور سلیقے اور جذبات وغیرہ سے متعلق ہیں؛ یہ اسی طرح ہے کہ جیسے ہر شخص اپنے ذوق وسلیقہ کے مطابق رنگ کو پسند کرتا ہے،

اگر چہ یہ باتیں معنی رکھتی ہیں لیکن ان پر کوئی دلیل اور برہان نہیں ہے۔

بہر حال دینی پلورالزم کی تیسری تفسیر کے مطابق ادیان اور دینی باتوں میں اختلاف کی مثال یا رنگ جیسی چیز ہے کہ مطلق طور سے نہیں کہا جاسکتا کہ سبز یا زرد رنگ اچھا ہے یا ایک اچھا ہے اور دوسرا خراب ہے بلکہ ہم کو یہ کہنا چاہئے کہ دونوں اچھے اور بہتر ہیں۔ یا یہ کہیں کہ ہم چونکہ ان کی حقیقت سے نا آشنا ہیں؛ اوران کے قبول یا رد کرنے پر ہم کوئی دلیل بھی نہیں رکھتے لہٰذا ان کے بارے میں ہم کو جھگڑا نہیں کرنا چاہئیے بلکہ ہم کو اس بات کا اعتقاد رکھنا چاہئیے کہ سب

کے سب برابر ہیں ان ادیان میں کوئی بھی فرق نہیں ہے اور جس کسی کو بھی چاہیں اختیار کر لیں اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

دینی پلورالزم کی تیسری تفسیر کا تجزیہ

اس تفسیر پر نقد وتبصرہ کے لئے جو راستہ ہمارے پاس ہے وہ یہ کہ اس کے معرفت شناسی ہی کے مبنیٰ اور اصول کو بحث کا موضوع قرار دیں اور اس میں غور وفکر کریں؛ اس کے لئے ہم کو سب سے پہلے اس بات پر توجہ کرنی چاہئے کہ معرفت شناسی کی بحث میں ہم کو مندرجہ ذیل سوالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

(۱) جیسا کہ افراطی "پوزیٹیوسٹ" دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اشیاء جو کہ واقعی اعتبار سے حس اور تجربہ کے قابل نہیں ہیں وہ بے معنی ہیں؟

(۲) کیا وہ باتیں جو کہ افکار و اقدار کے مفاہیم پر مشتمل ہیں اور کسی چیز کے صحیح یا غلط ہونے یا ان کے اچھے یا برے ہونے کو بتاتے ہیں؛ ان کو سچ یا جھوٹ سے متصف نہیں کیا جا سکتا اور ان کے بارے میں حق و باطل کو پیش نہیں کیا جا سکتا؟

(۳) کیا عام طور پر ہر معرفت چاہے صحیح اور حق ہونے سے متعلق ہو یا غلط اور باطل ہونے سے، نسبی ہے اور کوئی بھی بات مطلق و پائدار اور یقینی نہیں ہے؟ یا ایسا نہیں ہے بلکہ ہم ان تمام جگہوں پر یقینی باتوں کو جان سکتے ہیں۔

(٤) خاص طور پر دینی معرفت کیا دینی معرفت کے متعلق، یقینی، مطلق انداز میں اور ثابت

طریقے سے پائی جاتی ہے؟ یا یہ کہ تمام دینی معرفتیں خود ہماری فہم اور سمجھ کی تابع ہیں کہ جسے آج کی اصطلاح میں ہماری" مختلف قرائتیں" کہا جاتا ہے۔ یہ بحث وہی ہرمنوٹکا ور دینی باتوں کی ہرمنوٹک تفسیر کی بحث ہے۔

دینی پلورالزم کا یہ تیسرا بیان آیا صحیح ہے یا غلط؟ پہلے ان مذکورہ سوالات کے جواب واضح ہوں کہ انشااللہ ہم آئیندہ بحث میں جن کو بیان کریں گے۔

دینی پلورالزم (۳)

پلورالزم نظریہ کی پیدائش میں نفسیاتی عوامل پر دوبارہ ایک سرسری نظر

پچھلے جلسہ میں اس بات کی جانب اشارہ کیا گیا تھا کہ پلورالزم کی فکر پیدا ہونے میں جو اسباب وعوامل ہیں ان میں ایک نفسیاتی سبب بھی ہے جو کہ بہت سے لوگوں خاص کر جوانوں میں پایا جاتا ہے، جب وہ دیکھتے ہیں کہ دنیا میں بہت سے ادیان و مذاہب پائے جاتے ہیں اور بہت سے لوگ خلوص اور سچائی کے ساتھ اس کو مانتے اور اس پر عمل کرتے ہیں تو ان کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ سب لوگ جہنم میں جائیں گے؟ اور فقط ایک مختصر سی جماعت جو کہ مسلمانوں ہیں وہ بھی مسلمانوں کا ایک خاص گروہ (شیعہ) ہی جنت میں جائیں؟ اور یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ شیعوں میں بھی وہی لوگ جن سے کوئی گناہ نہ ہوا ہو یا اگر گناہ ہوگیا ہو تو انھوں نے توبہ کر لی ہو بس وہی جنت میں جائیں گے؛ چونکہ یہ بات

عام طور سے لوگوں کے لئے ناممکن لگتی ہے اور وہ اس کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں لہذا یہ مسئلہ ان کے ذہن میں تقویت کرجاتا ہے کہ تمام دین کے ماننے والے یا کم سے کم وہ لوگ جوکہ اپنے دین کے پابند ہیں اوران کے احکام پر عمل کرتے ہیں وہ بھی نجات کے مستحق ہیں اور بہشت میں جائیں گے۔

پہلے جلسہ میں ہم نے اس بات کی جانب اشارہ کیا تھا کہ اس شبہہ کو ذہن سے دور کرنے کے لئے اس نکتہ کی طرف توجہ دینا ہوگا کہ جس وقت ہم یہ کہتے ہیں: "دین حق فقط اسلام ہے اور اس کی پیروی انسان کے لئے کامیابی اورنجات کا سبب بنتی ہے" اس کا نتیجہ اورلازمہ یہ نہیں ہے کہ دوسرے تمام انسان جہنم میں جائیں گے۔ بلکہ یہاں دوسرے تمام انسانوں کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے (البتہ ان دوگروہوں میں اکثریت کس گروہ میں ہیں اورکون لوگ اقلیت میں ہیں یہ ایک حسابی بحث ہے جو کہ ہماری گفتگو سے مربوط نہیں ہے)، وہ دونوں گروہ یہ ہیں:

(۱) پہلے گروہ میں وہ لوگ ہیں جوحق کوتلاش کرتے ہیں اوراس کی جستجو میں محنت ومشقّت کرتے ہیں؛ اورواقعی طور سے اس بات کی کوشش میں ہیں کہ حق کوحاصل کرلیں لیکن کسی بھی سبب سے اس کونہیں پاسکے ہیں۔

(۲) دوسرے گروہ میں وہ لوگ ہیں جوتحقیق کے حالات اوراسباب فراہم ہونے کے باوجود حق کوتلاش نہیں کرتے ہیں یا یہ کہ ان کے نزدیک حق واضح تھا کہ فقط مذہب اسلام حق ہے، پھر بھی اس کوقبول نہیں کیا جولوگ جہنم میں جائیں گے یہی دوسرے گروہ والے ہیں؛

لیکن پہلے گروہ والے جنھوں نے حق کے تلاش کرنے کی کوشش کی ہے یا اس کو پہچاننے میں غلطی کر بیٹھے ہیں اور حق تک پہونچنے سے رہ گئے ہیں ان کے ساتھ دوسری طرح سے سلوک کیا جائیگا ان افراد کو علم فقہ وکلام کی روشنی میں مستضعف] کہ جس سے مراد یہاں پر مستضعف فکری ہے [کہا جاتا ہے اگران لوگوں نے انھیں حقائق پر عمل کیا ہے یا جو اپنی عقل سیا یک خاص دین کی تعلیمات کے ذریعہ ان کو حاصل کیا ہےتو وہ لوگ اپنے نیک عمل کی جزا پائیں گے۔

البتہ یہ بات کہ کیا یہ لوگ جہنم کے نچلے طبقہ میں جگہ پائیں گے، یا جنت وجہنم کے درمیان ان لوگوں کے لئے کوئی بیچ کا حصّہ مخصوص ہوگا، یا یہ کہ قیامت کے میدان میں ایسے لوگوں کے لئےسوال وجواب کا کوئی امتحان منعقد ہوگا، یہ سب دوسرے مسائل ہیں (جو کہ تفصیلی بحث چاہتے ہیں)لیکن بہرحال یہ گروہ ابدی عذاب میں گرفتار اور مبتلانہیں رہے گا۔

آیہ "ومن یبتغ غیر الاسلام دیناً" کی توضیح

جو سوال اس جگہ سامنے آتا ہے (دراصل گذشتہ مطالب کو مختصراً میں نے اس سوال کو پیش کرنے کے لئے بیان کیا تھا) وہ یہ ہے کہ قرآن کریم میں خداوند عالم فرماتا ہے: "ومن یبتغ غیرالاسلام دیناًفلن یقبل منہ" (۱) اور جو کوئی اسلام کے علاوہ کسی بھی دین کو تلاش کرے گا تو وہ دین اس سے قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ قیامت کے روز گھاٹا اٹھانے والوں میں ہوگا۔ یہ آیہ کریمہ بالکل واضح انداز میں اس بات کو بتاتی ہے کہ اسلام کے علاوہ کوئی بھی دین قابل

قبول نہیں ہے جب کہ آپ کے بیان کے مطابق دوسرے ادیان بھی کم وزیادہ کچھ نہ کچھ قبول کئے جائیں گے اس مشکل کو کس طرح حل کیا جائے گا؟

یہ آیہ ایک تفسیری بحث رکھتی ہے اگر اس کی تفصیل میں جائیں گے تو اصلی بحث سے خارج ہو جائیں گے لیکن پھر بھی اس مطلب کو مختصراً عرض کرتے ہیں۔

....

(۱) سورہ آل عمران: آیہ ۸۵۔

وہ دین جو کہ حضرت ابراہیم کے زمانے میں لوگوں کے لئے آیا تھا؛ حقیقت میں وہ بھی دین اسلام تھا اور لوگوں کے لئے ضروری تھا کہ اس دین پر عمل کریں جب تک کہ کوئی نئی شریعت نہ آجائے۔جس وقت حضرت موسیٰ شریعت لیکر آئے تو حضرت ابراہیم کی شریعت منسوخ ہوگئی ؛لیکن حضرت موسیٰ کا دین بھی دین اسلام تھا فرق صرف اتنا تھا کہ بعض احکام جو حضرت ابراہیم کی شریعت میں تھے وہ منسوخ ہو گئے ؛حضرت موسیٰ کی شریعت بھی حضرت عیسیٰ کی شریعت آنے کے بعد منسوخ ہوگئی؛ اور لوگوں پر ضروری ہوگیا کہ وہ نئی شریعت کے مطابق جو کہ حضرت موسیٰ سے کچھ فرق رکھتی تھی اس پر عمل کریں لیکن پھر بھی حضرت عیسیٰ کا دین وہی تھا جو کہ حضرت موسیٰ کا دین تھا اور آخرکار پیغمبر اکرم کے آنے سے پچھلی شریعتیں منسوخ ہوگئی ؛اور لوگوں پر ضروری ہو گیا کہ لوگ شریعت محمدی پر عمل کریں ؛اور ہم جانتے ہیں کہ شریعت محمدی وہی دین اسلام ہے؛ لیکن یہ شریعت کچھ خاص اور اہم قوانین واحکام لیکر آئی جو کہ اس شریعت کو دوسری شریعتوں ممتاز اور جدا کرتی ہے یہاں پر اسلام نے ایک خاص معنی پیدا کر

لئے اور وہ وہی معنی ہیں جن کو ہم سمجھتے ہیں۔ اس وضاحت سے یہ بات روشن ہوگئی کہ اسلام مختلف مصداق رکھتا ہے اسلام کا ایک مصداق شریعت ابراہیمی ہے؛ اس کا دوسرا مصداق حضرت موسیٰ کی شریعت ہے اسی طرح دوسرے اور مصداق بھی ہیں؛ لہذا اس آیہ کا مطلب اور مفہوم یہ ہوا کہ جو کوئی بھیان مصادیق اسلام سے جس مصداق کے زمانہ میں ہو تو اس کو وہی قبول کرنا ہوگا اور دوسرا دین اس سے قبول نہیں کیا جائے گا؛ بہر حال اس میں کوئی بھی شک نہیں ہے کہ جس کسی نے بھی حضرت موسیٰ، عیسیٰ، یا ابراہیم کے دین کو قبول کیا ہے اس کا دین خدا کے یہاں قابل قبول ہے لہذا اس آیت کا یہ مطلب کہ (اس زمانے میں جو کوئی بھی اسلام کے علاوہ کسی بھی دین کو قبول کرے گا اس کو خدا قبول نہیں کرے گا) اس کے معنی یہ ہیں کہ اس زمانے میں بھی خدا نے جو دین پیغمبروں کے ذریعہ بھیجا تھا اس کو بھی قبول کرے اور ان خاص احکام کو بھی جن کو رسول اکرم لیکر آئیں ہیں قبول کرے۔ البتہ ایک شریعت کے ذریعہ دوسری شریعت کے احکام کا نسخ ہونا مخصوص نہیں ہے بلکہ ممکن ہے کہ ایک ہی شریعت اپنے کچھ پچھلے احکام کو نسخ کر دے؛ مثلاً شروع اسلام، میں مسلمانوں کو حکم تھا کہ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھیں اور یہ حکم یہاں تک مکہ سے مدینہ کو ہجرت کے بعد تک باقی رہا؛ لیکن جب رسول اکرم نے ہجرت کی اور مدینہ آئے تو خدا کے حکم سے قبلہ بیت المقدس سے کعبہ کی سمت ہو گیا۔ لہذٰا بعض احکام کا نسخ ہونا اصل دین کے بدلنے کا سبب نہیں ہوتا ہے؛ اصل دین توحید، نبوت، قیامت کا اعتقاد ہے۔ تمام انبیاء پر ایمان رکھنا ہی نبوت کا اعتقاد ہے قرآن مجید میں ارشاد ہو رہا ہے: " آمن الرسول بما انزل الیہ من ربّہ " (۱) رسول ان تمام باتوں پر

ایمان رکھتا ہے جواس کے پروردگار کی طرف سے نازل کی گئی ہیں اور مومنین بھی سب کے سب اللہ اوراس کے ملائکہ، رسول اوران کتابوں پر جو وہ لیکر آئے ان پر ایمان رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم رسولوں کے درمیان فرق کے قائل نہیں ہیں یعنی ہم کسی بھی پیامبر کی تکذیب نہیں کرتے اور نہ ہی اس کا حق رکھتے ہیں اور سب کو واجب الا طاعت سمجھتے ہیں البتہ اگر موسیٰ، عیسیٰ بھی اس زمانے میں ہوتے تو وہ بھی شریعت محمد مصطفی پر عمل کرتے۔

....

(۱) سورہ بقرہ آیہ ۲۸۵

دین اختیار کرنے میں ہماری ذمہ داری اور دوسرے ادیان کے پیروکاروں کا حکم

لہذٰا اس زمانے میں ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم قرآن، پیغمبر اور ائمہ علیھم السلام کے احکام پر عمل کریں اور اگر اس کے علاوہ کسی اور کے حکم پر عمل کریں گے تو وہ قبول نہیں ہوگا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ دین حقیقی طور پر پچھلے ادیان سے جدا ہے اگر چہ ادیان بعض احکام میں جدا ہیں اور اختلاف رکھتے ہیں لیکن کلی اصول اور بہت سے احکام میں سارے ادیان ایک دوسرے سے مشابہت رکھتے ہیں اور وہ سب اسلام میں ہیں، لہذٰا اگر کوئی شخص حق کو پہچاننے یا مشخص و معین کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تو وہ مستضعف ہے اور اس نے جتنا پہچانا ہے اتنا ہی اس کو عمل کرنا چاہیئے، اسی پر اس کو ثواب ملے گا لیکن اگر کسی نے کسی زمانے میں حق

کو پہچانا اور اس کے باوجود اس کی مخالفت کی اور دشمنی اختیار کی تو ہمیشہ ہمیشہ جہنم کی آگ میں جلے گا، یہ مطلب دعائے کمیل کے اس فقرے سے بھی ظاہر ہوتا ہے، مولا علی فرماتے ہیں: اقسمت ان تملا ھا من الکافرین من الجنۃ والناس اجمعین وان تخلد فیھا المعاندین" اے خدا! تو نے قسم کھا کر کہا ہے کہ اس جہنم کو تمام جن وانس کہ جو کافر ہوں گے بھر دوں گا اور وہ لوگ جو تیرے دین سے دشمنی رکھتے ہیں ان کو اس جہنم میں ہمیشہ ہمیشہ رکھے گا، بہر حال جو لوگ بھی خدا کے دین سے دشمنی اور عناد رکھتے ہیں وہی لوگ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے،لیکن اگر کوئی شخص عناد و دشمنی نہیں رکھتا ہے اگر وہ عذاب میں مبتلا بھی ہوگا تو اسی مقدار میں جتنا اس نے گناہ اور کوتاہی کی ہے، مستضعفین بھی اسی مقدار میں عذاب سے معاف رہیں گے جتنا وہ حق کو نہیں پہچان سکے ہیں۔ اس مقام پر جس مطلب کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے وہ یہ کہ اگر مسلمانوں (شیعوں) کے علاوہ جو لوگ جہنم میں نہیں جائیں گے تو وہ اس وجہ سے نہیں کہ ان کا دین حق پر تھا بلکہ اس وجہ سے کہ ان کے پاس عذر ہے؛ البتہ جیسا کہ پہلے اشارہ ہو چکا ہے جو لوگ پچھلی شریعت جیسے موسیٰ یا عیسیٰ کے دور میں زندگی بسر کر کر رہے تھے ان کی ذمہ داری اسی شریعت پر عمل کرنے کی تھی۔ بہر حال دین حق اور صراط مستقیم صرف ایک ہی ہے، اور جو لوگ اس ایک صراط مستقیم یعنی اسلام کے علاوہ کسی دین پر رہ کر جہنم میں نہ جائیں گے تو اس کا لازمہ یہ نہیں ہے کہ دین حق اور صراط مستقیم (سیدھے اور صحیح راستے) ایک سے زیادہ ہیں۔

نفسیات سے متعلق ایک نکتہ

ایک نکتہ اس جگہ پر بہت اہم ہے وہ یہ کہ انسان ہمیشہ ایسا نہیں ہے کہ پہلے کسی چیز کی خوبی اور اچھائی کے بارے میں دلیل کو تلاش کرے اور جب دلیل مل جائے تو اس چیز کو اختیار کر لے بلکہ کبھی کبھی مسئلہ اس کے برخلاف ہوتا ہے یعنی پہلے کوئی چیز انسان کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے اور اس کو اچھی لگتی ہے، اس کے بعد اس کے اچھے ہونے یا صحیح ہونے پر دلیل لاتا ہے؛ اس طرح کے موقعوں پر انسان اپنے دل کی حرکت کا تابع ہوتا ہے کبھی تو یہ اچھی اور صحیح چیز ہوتی ہے اور کبھی کبھی غلط ہوتی ہے۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ پہلے ان کا دل کسی چیز کو قبول کر لیتا ہے اس کے بعد کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح بھی عقل کو دل کے ساتھ ہماہنگ کر لیں؛ یعنی اس چیز کو ثابت کرنے کے لئے دلیل لاتے ہیں۔ یہ بات بہت سے ان لوگوں پر بھی صادق آتی ہے جو کہ رسول اکرم پر ایمان لائے تھے؛ بہت سے لوگ ایسے نہیں تھے کہ پہلے تحقیق کریں اور اسلام کے اعتقاد کی تلاش و جستجو کریں اور جب تحقیق و جستجو کر لیا ہو اور توحید وخدا کی حقانیت ان کے لئے ثابت ہو گئی ہو تب ایمان لے آئے ہوں؛ بلکہ انھوں نے صرف رسول اکرم کی رفتار اور ان کے اخلاق کو دیکھا تو ان کے دل نے کہا کہ وہ بھی آنحضرت کی طرح ان کے ساتھ ہوں لہٰذا وہ ان کے ساتھ ہو گئے؛ پہلے ان کے دل نے قبول کیا اس کے بعد پھر اس پر دلیل پیش کی۔ یہ بات باطل میں بھی پائی جاتی ہے؛ یعنی چونکہ انسان ایک غلط چیز کی طرف رجحان رکھتا ہے اور اس کا دل اس کو چاہتا ہے تو وہ اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح اس کی توجیہ کرے؛ بہت سے لوگوں نے گناہ، اور برائی کی عادت کر لی ہے

ان کا دل چاہتا ہے کہ ہر طرح آزاد رہیں ؛اور جس چیز کا بھی دل چاہے اس کو انجام دیں ؛ظاہری بات ہے ایسے لوگ اس بات کے لئے تیار نہیں ہیں کہ حساب وکتاب اور قبر و قیامت ہو؛ان کا دل اس بات کو گوارا نہیں کرتا اور نہ اس بات کو قبول کرتے ہیں کہ ان کی عمر کا ہر لمحہ اور ان کی زندگی کا چھوٹا سا عمل بھی کسی کے زیر نظر رہے،اور ہر چیز کے بارے میں سوال و جواب ہوگا اسی لئے ان کا دل چاہتا ہے کہ حساب و کتاب نہ ہو؛اور ان خواہشوں کے لئے انسان کوشش کرتا ہے کہ قیامت اور آخرت کے انکار کے لئے دلیل تلاش کرے،قرآن میں اسی سے متعلق خدا فرماتا ہے:" ایحسب الانسان ان لن نجمع عظامہ بلیٰ۔۔۔" (۱) کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہیں کر پائیں

....

(۱) سورہ قیامت: آیہ ۳ الیٰ ۵۔

گے؟ یقیناً ہم تو اس بات پر بھی قدرت رکھتے ہیں کہ ان کی انگلیوں کے پور کو بھی از سر نو ویسے ہی درست کر دیں؛ بلکہ انسان تو فقط یہ چاہتا ہے کہ اپنے سامنے برائی کرتا چلا جائے وہ انسان جو قیامت کا انکار کرتا ہے واقعاً کیا وہ فکر کرتا ہے کہ ہم اس کو دوبارہ زندہ نہیں کر پائیں گے؟ اگر وہ تھوڑی سی بھی فکر کرے اور عقل و فہم سے کام لے تو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے کہ وہ خدا جس نے انسان کو عدم سے وجود بخشا کیا دوبارہ اسی انسان کو زندہ نہیں کر سکتا ہے یقیناً یہ کام پہلے سے زیادہ آسان ہے چونکہ شروع میں انسان کچھ بھی نہیں تھا اور خدا نے اس کو پیدا کیا اور اب تو کم سے کم گوشت اور ہڈّی تو ہے اگر چہ بوسیدہ اور سڑ گل گئی ہیں لہٰذا انسان کی عقل اس بات

کو آسانی سے قبول کر لیتی ہے کہ جس ہاتھ نے انسان کو پہلی مرتبہ پیدا کیا ہے وہی قدرت دوبارہ اسی بوسیدہ اور سڑی گلی ہڈیوں اور گوشت کو جمع کر کے زندہ کر سکتا ہے، لہٰذا قیامت کے منکر اس حد تک اپنی بات پر کیوں اصرار کرتے ہیں؟ وہ صرف اس لئے کہ "بل یرید الانسان لیفجر امامہ" یعنی انسان چاہتا ہے کہ آزاد رہے کسی کی قید و بند میں نہ رہے، بلکہ اسکو اس بات کی بھی آزادی حاصل رہے کہ جس گناہ اور برائی کو بھی اس کا دل چاہے اس کو انجام دے؛ اور اس کے کام میں کوئی بھی حساب و کتاب نہ ہو، بس اس جگہ پہلے اس کے دل نے فتویٰ دیا کہ آخرت اور قیامت وغیرہ نہیں ہے اس کے بعد اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ اس بات پر دلیل لائے اجتماعی مسائل اکثر ایسے ہی ہیں کہ جن میں بجائے اس کے کہ دل عقل کے پیچھے ہو، عقل دل کے پیچھے پیچھے چلتی ہے۔ اس کا زندہ ثبوت ہمارے زمانہ میں پایا جا رہا تھا وہ مرکس ازم کی طرف لوگوں کا رجحان اور اعتقاد تھا ایسا نہیں ہے کہ ان لوگوں نے پہلے جا کر ماٹریالزم اور ڈیالکٹک کے اصول پر بحث اور جستجو کی ہو اور دلیل و برہان سے ان کے لئے ثابت ہوا ہو کہ مادہ کے علاوہ کوئی چیز موجود نہیں ہے اور مارکسی اقتصاد اور اس سے متعلق سارے مسائل صحیح اور درست ہیں۔ میں خود ایسے بہت سے لوگوں کو جانتا ہوں جو کہ مسلمان نمازی اور روزہ دار تھے لیکن مارکسسٹ تھے اور ان کی فکر تھی کہ یہ دونوں چیزیں (اسلام اور مارکس ازم) جمع ہوسکتی ہیں۔ آخر ان لوگوں نے مارکیزم کی طرف رجحان کیوں پیدا کر لیا تھا؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں نے سماج اور عوام کے درمیان ظلم و ستم اور دولت و ثروت کی ذخیرہ اندوزی کو دیکھا وہ اس بات کو دیکھ رہے تھے کہ کچھ لوگ دولت کی زیادتی کے سبب اس بات سے لاعلم

تھے کہ اس کو کس طرح سے خرچ کیا جائے ،اس کے مقابلے میں کچھ لوگ بہت ہی فقیری اور مفلسی میں زندگی بسر کررہے تھے اس وقت ان لوگوں نے سوچا کہ یا تو سرمایہ داری کو قبول کر لیں یا مارکس ازم کو قبول کر لیں ،سرمایہ داری کا انجام معاشرہ میں یہی واضح اور افسوسناک طبقاتی فاصلہ تھا

لہذا ان لوگوں نے مارکس ازم کو قبول کرلیا؛اس کے بعد مارکس ازم کو قبول کر لیتے تھے تو رفتہ رفتہ علمی اصطلاح میں مارکس ازم کے لئے دلیل بھی تلاش کرنا شروع کر دیتے تھے اور آہستہ آہستہ ماٹر یالیزم اور مادہ کی اصالت کو قبول کر لیتے تھے پلورالزم کے بارے میں بھی بعض جگہوں پر اکثر لوگوں کی ایسی ہی کہانی ہے پہلے ان کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم اس بات کو کس طرح قبول کریں کہ تمام کے تمام لوگ جہنم میں جائیں گے اور بہت کم ہی لوگوں کو نجات حاصل ہوگی ؟ ہم اس بات کو قبول نہیں کر سکتے ،ایک ایسا راستہ اختیار کریں کہ دوسرے لوگ بھی جنت میں جا سکیں۔اس فکر کے پیچھے ان لوگوں نے اس نظریہ کو پیش کیا کہ ※ سارے دین حق پر ہیں" اور اس بات کی کوشش کی کہ اس بات کو ثابت کرنے کے لئے دلیل بنائی جائے۔

کون سا فلسفی اور معرفت شناسی کا مبنیٰ پلورالزم کی طرف منتہی ہوسکتا ہے

لیکن بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں کہ شروع میں ایک خاص فکری اور فلسفی مبنیٰ اختیار کرتے ہیں اور اسی مبنیٰ اور اصول کی بنیاد پر پلورالزم تک پہونچتے ہیں، یہ نہیں کہ پہلے ان کے دل نے اس بات کو چاہا ہو پھر عقل نے دل کی بات کو مانا ہو اور عقل نے دل کے پیچھے حرکت کی ہو۔اس جگہ ہم اس بات کا جائزہ لیں گے کہ وہ کون سے فلسفی مبنیٰ ہیں کہ اگر انسان ان سے شروع کرے تو پلورالزم تک پہونچ سکتا ہے؟

واقعیت کو جاننے اور حقیقت کو معلوم کرنے کے لئے اگر کوئی یہ اعتقاد رکھے کہ عقل ہر چیز کی حقیقت کو واضح اور کشف کرسکتی ہے تو فطری طور سے ایک ہی مسئلہ میں وہ متعدد حقائق کو قبول نہیں کرے گا؛ ایسا شخص فطری طور پر حقیقت کو ایک ہی چیز جانتا ہے اور پھر چاہتا ہے کہ اور اس ایک حقیقت کو دلیل و برہان سے حاصل کرلے۔اگر اس کو ایک حساب یا فیزکس کا سوال دیں تو وہ اس بات کا اعتقاد رکھتا ہے کہ اس کا صحیح جواب صرف ایک ہی ہوگا؛ اگر وہ شخص جواب حاصل کرلیتا ہے تو جانتا ہے کہ یہ جواب یا تو صحیح ہوگا یا غلط؛ یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کے کئی جواب صحیح پائے جاتے ہوں۔

لیکن اگر کوئی حقیقت کی شناخت کے مسئلہ میں اس بات کا اعتقاد رکھتا ہو کہ انسان کے پاس واقعیت تک پہونچنے کے لئے کوئی راستہ نہیں ہے اور اس کو حاصل کرنے کے لئے جس وسیلہ کو بھی، چاہے وہ عقل ہو یا تجربہ، استعمال کرتا ہے تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ حقیقت

سے قریب ہوسکتا ہے لیکن واقعیت تک نہیں پہونچ سکتا ،اسی جگہ پر مختلف قسم کے نظریوں جیسے نسبیت، شکّا کیت اور پلورالزم وغیرہ میں انسان مبتلا ہو جاتا ہے۔ آج اس نظریے کے طرفدار اور حامی پوری دنیا میں پائے جاتے ہیں کہ حقیقت، انسان کی معرفت وعقل اور اس کے علم سے بالاتر ہے، انسان جس قدر بھی کوشش کرے وہ واقعیت کے صرف چند آثار کو حاصل کرسکتا ہے اور حقیقت کے کچھ ہی پہلو اور وجہیں اس کے لئے واضح اور ظاہر ہوتی ہیں، پوری حقیقت کو حاصل نہیں کرسکتا۔ دنیا کے مختلف مکاتب فکر جیسے مکتب کانٹ، نیو کانٹ، شکّا کیت اور نسبیت اس جہت میں مشترک نظریہ رکھتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ" ہم کبھی بھی واقعیت کو مکمل طور سے درک نہیں کرسکتے"۔

اس فلسفی مبنیٰ کی بنیاد پر کہ جھوٹ اور سچ نسبی ہیں یعنی تمام خبریں واقعیت کے فقط کچھ حصّہ کو ہی بتاتی ہیں اور حقیقت کی ایک نسبت کو واضح کرتی ہیں اور جو خبریں سو فیصد حقیقت کو بتاتی ہوں وہ پائی ہی نہیں جاتی ہیں۔ تمام علمی خبریں بھی اسی خصوصیت کی حامل ہیں اور اصلاً علم کی ماہیت اس کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہے۔ ہم یہ تصور نہ کریں کہ علم آ کر کہے گا کہ" فقط یہی ہے اور اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے" ہرگز نہیں علم نہ ایسا دعویٰ کرتا ہے اور نہ ایسا کبھی ہوسکتا ہے۔ علمی نظریہ میں بات صرف تائید اور ابطال کی ہوتی ہے، نہ کہ حقیقت کے کشف ہونے یا کشف نہ ہونے کی ۔ زیادہ سے زیادی علمی نظریہ کا دعویٰ اور ادّعا یہ ہوتا ہے کہ جب تک مجھ پر کوئی اشکال یا نقض نہ آ جائے مجھ کو حق ہونے کی تائید حاصل ہے اور اگر کوئی اعتراض ہوگیا تو میں باطل ہوجاؤں گا اور دوسرا نظریہ میری جگہ لے لے گا یہ سیر وروش اسی طرح آگے بڑھتی رہتی

ہےاور علمی نظریات ایک کے بعد دوسرے مکمل ہوتے رہیں گےاور علم میں کوئی ایسا نظریہ ہی نہیں پایا جاتا جو کہ ہمیشہ باقی رہےاور قائم وثابت رہ جائے۔

جولوگ معرفت شناسی اوراس کے اقدار کی بحث میں اس فکر کی تائید کرتے ہیں اوراس کے طرفدار ہیں وہ لوگ منطق وفلسفہاور معقولات والٰہیات کوایک طرح حقارت کی نظر سے یاد کرتے ہیں اوراس بحث کوغیر علمی اور ہرطرح کے اعتبار سے خالی تصور کرتے ہیں؛اورجس وقت ایسی بحثیں ہوتی ہے تو ایک خاص حالت اور معنی دار انداز سے کہتے ہیں کہ" اس کو چھوڑیئے یہ تو فلسفہ ہے" یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم فقط علم کی عظمت واہمیت کے قائل ہیں اور علم کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ واقعیت کوسو فیصد واضح اور ظاہر کرے بلکہ ہرنظریہ واقعیت کی وجہوں میں سے کسی ایک وجہ کونہ کہ سبھی کو بتاتا ہے۔

نیوٹن کا قانون" جاذبہ(کشش)" ہمارے لئے واقعیت کےصرف ایک حصہ کو بتاتا ہے،اور انیشٹین کا قانون" نسبیت" بھی واقعیت کی دوسری وجہ کو ہمارے لئے ظاہر کرتا ہے؛اورکوئی بھی قانون ہمارے لئے ساری واقعیت کوظاہرنہیں کرتالہذا بات جب ایسی ہےتو دونوں صحیح ہیں یہ بھی اور وہ بھی۔اوراس طرح سے ہم معرفت شناسی میں ایک طرح کثرت پرستی تک پہونچ جاتے ہیں جوکہ واقع میں ایک نسبیت پرستی اورشکّا کیت ہےالبتہ بعض لوگ اس بات کے قائل نہیں ہیں کہ اس نظریہ کو شکاکیت کی طرف پلٹائیں بلکہ یہ کہتے ہیں کہ اس نظریہ کا لازمہ نسبیت پرستی ہے،لیکن پھر بھی شکّاکیت اس میں پائی جاتی ہے بہرحال یہ چیز اہم نہیں ہے کہ اس کا کیا نام رکھا جائے شک گرائی یا نسبت گرائی؛ہرحال میں اس نظریہ کا خلاصہ یہ

ہے کہ واقعیت کو ہم کبھی بھی نہیں حاصل کر سکتے ہیں یعنی علم ہم کو کبھی بھی (سو فیصد) اعتقادِ یقینی کی منزل تک نہیں پہونچا سکتا۔

بلّوری مثلث کی مثال کے ذریعہ پلورالزم کی وضاحت

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے ممکن ہے کہ یہ نظریہ پلورالزم کی فکر کا مبنیٰ ہو کیونکہ علم کی اس تفسیر کی بنیاد پر جو ابھی پیش کی گئی ہے ہر علمی نظریہ، بلّوری مثلث کے ایک زاویہ اور ایک رخ کے مانند ہے جو کہ واقعیت کے ایک حصّہ کو ظاہر کرتا ہے اور جو کوئی بھی جس زاویہ پر نگاہ ڈالتا ہے وہ واقعیت اور حقیقت کے اسی حصہ کو دیکھتا ہے پوری واقعیت کا نظارہ کرنا سب کے بس کی بات نہیں کیونکہ اور یہ واقعیت بلّوری مثلث کے مختلف حصّوں میں پھیلی ہوئی ہے۔

اگر پلورالزم کی اس طرح تفسیر کریں تو اس وقت یہ کہہ سکتے ہیں کہ حقیقت ایک ہی ہے البتہ ایک ایسی حقیقت جو ہر شخص کے لئے الگ الگ طرح سے جلوہ گر ہوتی ہے، یعنی ایک حقیقت واقع میں وہی پورا بلّوری مثلث ہے جو کہ کئی سطوح اور مختلف حصّوں میں ہے اور ہر علمی نظریہ اس کی ایک سطح اور حصّہ جیسا ہے،

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی بھی پوری حقیقت کو شامل نہیں ہوتا ہے اگر بلّوری مثلث کی اسی مثال اور تشبیہ کو نگاہ میں رکھیں اور چاہیں کہ پلوالزم کے بارے میں زیادہ واضح طور سے گفتگو کریں تو اس کی ایک تفسیر یہ ہوگی کہ حقیقت ایک ہے لیکن اس تک پہونچنے کے راستے الگ الگ ہیں؛ جس طرح بلّوری مثلث کہ ایک چیز سے زیادہ نہیں ہے لیکن چونکہ جو شخص اس کی

طرف ایک زاویہ سے دیکھتا ہے ممکن ہے اس کی نگاہ میں واقعیت کی تصویر دوسرے لوگوں کی بہ نسبت مختلف نظر آتی ہو؛ اس لئے کہ بلّوری مثلث کے کئی رخ اور زاویہ ہیں جو کہ ممکن ہے الگ الگ رنگ وخاصیت رکھتے ہوں۔

ایک بلّوری مثلث کو اپنے سامنے رکھیئے اس کے ایک طرف محدّب (ابھرا ہوا) آئینہ ہو دوسری جانب گہرا اور تیسری طرف مسطّح اور برابر آئینہ ہوا گر تین الگ الگ ایک ایک زاویہ سے اس بلّوری مثلث میں ایک شئے کی تصویر کو دیکھیں تو یقیناً وہ تین مختلف تصویروں کو دیکھیں گے جب کہ ہم الگ سے ناظر کے عنوان سے جانتے ہیں کہ یہ سب کے سب ایک ہی چیز کی تصویر کو دیکھ رہے ہیں جو کہ نظر کے زاویئے مختلف ہونے اور الگ الگ جگہ کھڑے ہونے کی وجہ سے خود گمان کرتے ہیں کہ تین مختلف چیزوں کو دیکھ رہے ہیں۔ بہر حال یہ وہی پلورالزم کی بہت سے سیدھے راستوں والی تفسیر ہے جو یہ کہتی ہے کہ ہم صرف ایک حقیقت رکھتے ہیں اور اس ایک حقیقت تک پہونچنے کے لئے کئی راستے پائے جاتے ہیں۔ تمام دین دار بلکہ سبھی انسانوں کا معبود اور مطلوب ایک ہے اور سب کے سب اس ایک حقیقت کے طالب ہیں بس فرق صرف اتنا ہے کہ ایک اسلام کا راستہ ہے اور ایک یہودیت کا راستہ ہے لیکن آخر میں سب ایک ہی مقصد اور منزل پر جا کر تمام ہوتے ہیں پلورالزم کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ ہم یہ نہ کہیں کہ حقیقت ایک ہے بلکہ بلّوری مثلث کے اطراف اور زاویوں کے مانند متعدد اور الگ الگ ہیں جو شخص جس زاویہ سے دیکھتا ہے اس کے لئے وہی حقیقت ہے چونکہ بلّوری مثلث کے اطراف اور اس کے رنگ جدا جدا ہیں جو کہ اس بات کا سبب بنتے ہیں کہ

ایک انسان حقیقت کو ہرا اور ابھرا ہوا، دوسرا اسی کو نیلا اور گہرا اور تیسرا انسان اسی کو پیلا اور مسطح دیکھتا ہے؛ حقیقت بھی ان تصویروں کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور تصویریں بھی واضح طور سے جدا جدا ہیں پس حقیقت بھی انھیں کی طبیعت میں مختلف ہوتی ہے ظاہر ہے کہ پلورالزم کی یہ تفسیر اس تفسیر سے مختلف ہے جس میں کہا گیا ہے کہ بہت سے سیدھے راستے ایک حقیقت کی طرف ختم ہوتے ہیں پلورالزم کی تیسری تفسیر یہ ہے کہ ہم ایک دین یا ایک علم کی ہر ایک بات کو الگ الگ نظر میں نہ رکھیں بلکہ ان تمام باتوں کے مجموعہ کے بارے میں یکجا صورت میں فیصلہ کریں؛ مثلاً جس وقت سوال کریں کہ شیعہ مذہب حق ہے یا باطل؛ تو تمام شیعی عقائد کے مجموعہ کو اپنی نگاہ میں رکھیں پلورالزم کی اس تفسیر کی بنا پر ہم کسی بھی مذہب کے حق یا باطل ہونے کا فیصلہ نہیں کر سکتے ہیں؛ کیونکہ تمام ادیان صحیح اور باطل دونوں اعتقادات و احکام سے مل کر بنے ہیں یا دوسرے لفظوں میں یہ کہا جائے کہ تمام ادیان حق بھی ہیں اور باطل بھی، حق اس اعتبار سے کہ اس کے بعض مطالب حق ہیں اور باطل اس اعتبار سے کہ اس کے بعض مطالب باطل ہیں۔

لہٰذا جب ایسا ہے کہ ہر مذہب کے بعض عقائد و افکار اور اس کے احکام اور خصوصیات سچ اور جھوٹ، حق اور باطل دونوں کا مجموعہ ہیں پس تمام ادیان برابر کی خصوصیات رکھتے ہیں اور جس دین کو بھی اختیار کر لیں کچھ فرق نہیں پڑتا ہے۔

دینی معرفت کے دائرہ میں وحدت حقیقت کا نظریہ

دینی پلورالزم کے نظریہ کے مقابلہ میں (اسکی مختلف تفسیروں کے ساتھ) ایک دوسرا اعتقاد یہ بھی ہے کہ مکمل طور سے کچھ دینی اعتقادات ایسے بھی پائے جاتے ہیں جو کہ سب کے سب حق اور صحیح ہیں اوراس کے مخالف اعتقادات باطل اور ناحق ہیں؛ یہ نظریہ اس بات کا معتقد ہے کہ حقیقت ایک ہے اوراس شخص اوراس شخص اس معاشرہ اوراس معاشرہ، اس زمانے اور اُس زمانے میں کوئی بھی فرق نہیں ہے ۔اس اعتقاد کی بنیاد پر ہمارے لئے ممکن ہے کہ ہم افکار واقدار احکام کا مجموعہ رکھتے ہوں جو کہ سب کے سب حقیقت رکھتے ہوں اوراس مجموعہ کے علاوہ دوسرے بقیہ مجموعہ باطل اور ناحق ہیں یا ان میں سے ہر ایک میں حق اور باطل دونوں پائے جاتے ہیں جو چیز ہم شیعوں کے ذہن میں پائی جاتی ہے وہ یہی ہے اگر آپ عام افراد کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ان کا اعتقاد یہ ہے کہ فقط شیعہ مذہب صحیح ہے اور یہی مذہب حق ہے؛ اور یہ وہ مذہب ہے کہ جس کا منبع اور سرچشمہ اھل بیت علیہم السلام اور چہاردہ معصومین ہیں اس کے علاوہ باقی جو مذہب اور ادیان پائے جاتے یا پوری طرح سے باطل ہیں؛ یا جس مقدار میں ان کے عقائد شیعہ مذہب کے مخالف ہیں اتنا وہ باطل ہیں ۔ یہ ایسی چیز ہے جو ہماری اور آپ کی فکر میں پائی جاتی ہے ۔اور پلورالزم کی فکر کے پیش ہونے سے پہلے کوئی بھی دین ومذہب کی حقانیت سے متعلق اس تصویر کے علاوہ کچھ اورنہیں خیال رکھتا تھا۔

مراجع تقلید کے فتوؤں میں اختلاف کا پلورالزم سے کوئی ربط نہیں ہے

جوسوال اس جگہ ذہن میں آتا ہے وہ یہ کہ مذہب شیعہ میں بھی چاہے وہ اعتقادی مسائل ہوں یا فقہی احکام، بہت جگہوں پر کئی نظریات پائے جاتے ہیں۔ان اختلافات کے رہتے ہوئے کس طرح ممکن ہے کہ ان احکام وعقائد کے ایک مجموعہ کو شیعہ مذہب کی طرف (جو کہ حق ہوں) نسبت دیا جائے؟ شیعہ علماء اور مراجع تقلید کے فتوؤں میں اختلاف یہ ایک ایسی چیز ہے جس کو سبھی لوگ جانتے ہیں مثلاً ایک مرجع تقلید کا فتویٰ ہے کہ نماز کی تیسری اور چوتھی رکعت میں ایک مرتبہ تسبیحات اربعہ کہنا کافی ہے دوسرا مرجع یہ فتویٰ دیتا ہے کہ ۳ مرتبہ کہنا ضروری ہے، یا عالم برزخ کے مسائل سے بعض امور مثلاً پہلی رات مرنے کے بعد کیا سوال وجواب ہوگا اس کے علاوہ دوسرے مسائل جس میں اختلاف واضح ہے جو کہ قیامت سے مربوط ہیں؛ ان کی تفصیلات میں علماء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کون سا نظریہ حق ہے اور کون سا باطل ہے؟ یہ شرعی مسئلہ ہے کہ اعلم کی تقلید کرنا چاہیے، لیکن اعلم کی تشخیص اور پہچان میں لوگوں کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے؛ اور ہر شخص مخصوص آدمی کو اعلم جانتا ہے اور اسی کی تقلید کرتا ہے۔لیکن بہر حال ایسا نہیں ہے کہ فقط ایک ہی مرجع کے مقلدین جنت میں جائیں گے؛ بلکہ جس نے بھی کسی مجتہد کو واقعی طور پر اعلم سمجھا اور اس کی تقلید کی اس کو نجات ملے گی اور وہ جنت میں جائے گا؛ اس جگہ پر جو شبہ ذہن میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ اگر مختلف ادیان کے درمیان بہت سے سیدھے راستوں کو قبول نہ کیا جائے تو کم سے کم شیعہ مذہب کے اندر مختلف سیدھے راستوں کے ہونے کا اقرار کرنا پڑے

گا؛اور مختلف عقائدو احکام کے مجموعہ کو صحیح اور حق پر ہونے کا اقرار کرنا پڑے گا لہٰذ اا س طرح سے بھی اس کی انتہا پلورالزم ہی کی طرف ہوگی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں مقام ثبوت اور مقام اثبات میں خلط ملط ہو گیا ہے؛ جنت میں جانے اور اسلام کے واقعی اور حقیقی حکم کو حاصل کرنے میں کوئی ملازمہ نہیں ہے۔ جو کچھ بھی علماء دین کی تقلید کے بارے میں پایا جاتا ہے وہ یہ کہ اگر آپ نے کسی مجتہد اعلم کو مشخص کر لیا اور اس کی تقلید کر لی؛تو اگر اس کے بعض فتوے خدا کے حکم واقعی کے مخالف بھی ہو جائیں تو آپ اس میں معذور ہیں اور حکم واقعی پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے آپ جہنم میں نہیں جائیں گے ؛تسبیحات اربعہ کے مسئلہ میں حقیقت اور واقعیت ایک ہی ہے؛ حکم خدا وند عالم یا یہ ہے کہ ایک مرتبہ تسبیحات اربعہ کافی ہے یا یہ کہ ۳ مرتبہ واجب ہے،جس فقیہ اور مجتہد کا فتویٰ خدا وند عالم کے حکم کے مطابق ہو اسی فقیہ کا فتویٰ صحیح اور درست ہے اور بقیہ مجتہدین کا غلط ہوگا لیکن یہ غلطی ایسی ہے کہ اس سے مجتہد اور اس کے مقلدین دونوں معذور ہیں چونکہ ان لوگوں نے حکم خدا تک پہونچنے کی پوری کوشش کی؛ اور اپنے فریضہ کو انجام دیا ؛لیکن کسی بھی سبب سے وہ اس تک نہیں پہونچ سکے یہاں یہ مسئلہ مستضعف فکری جیسا ہے جس کی طرف اس سے پہلے بھی ہم نے اشارہ کیا ہے۔

اسلام کے قطعی اور واضح احکام میں اختلاف کا نہ ہونا

ہم اسلام میں کچھ یقینی، پائدار، مطلق اور نہ بدلنے والے حقائق رکھتے ہیں جن کو عرف عام میں" ضروریات اسلام" کہا جاتا ہے کبھی ان حقائق کا دامن اور میدان وسیع ہوتا ہے تو ان کو اسلام کے مسلمات اور قطعیات سے یاد کیا جاتا ہے، یہ سب ایسی چیزیں ہیں کہ تمام مسلمانوں کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے ک۔ مثلاً تمام مسلمان جانتے ہیں کہ صبح کی نماز دو رکعت ہے اور یہ ایسا مسئلہ ہے کہ اس کے لئے تقلید ضروری نہیں ہے اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ ہم اس کی تحقیق و جستجو کریں بلکہ یہ واضح اور بدیہی ہے یہی وجہ ہے کہ بعض فقہاء فرماتے ہیں کہ اسلام کے واضحات میں تقلید نہیں ہے؛ یہاں تک کہ بعض اس بات کے معتقد ہیں کہ قطعیات اور مسلمات دین میں بھی تقلید جائز نہیں ہے؛ تقلید صرف ظنّیات (جن کے بارے میں یقین نہ ہو) میں صحیح ہے۔ یہ بات سب لوگ جانتے ہیں کہ صبح کی نماز ۲ رکعت ہے اور نماز کے واجب ہونے کا مسئلہ ایسی چیز ہے کہ اس کا صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ کافر بھی (جو کہ اسلام اور نماز کو قبول نہیں کرتے ہیں) جانتے ہیں کہ اسلام نماز کا حکم دیتا ہے اور نماز اسی رکوع اور سجدے اور بقیہ تمام افعال واذکار کا نام ہے۔ آج کون ایسا ہے جو اس بات کو نہ جانتا ہو کہ مسلمانوں کا حج ذی الحجہ کے مہینہ میں مکہ جا کر کچھ اعمال کو انجام دینا کہلاتا ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ نماز اور حج اسلام کا جز نہیں ہے تو اس کی بات قبول نہیں کی جائے گی اور اس سے کہا جائے گا کہ یہ سب اسلام کے واضحات اور مسلمات سے ہیں ان کے بارے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے اور ہر زمان ومکان میں ان کا انجام دینا ضروری ہے اور وہ

نا قابل تغییر ہیں یہاں تک کہ ان کے متعلق تقلید بھی صحیح نہیں ہے؛ کیونکہ ہر مسلمان اس بات کو جانتا ہے اسی وجہ سے اسلام کے ضروریات اور واضحات سے انکار کرنا مرتد ہونے کا سبب بنتا ہے البتہ امام خمینی کا نظریہ یہ ہے کہ ضروریات اسلام کا انکار، ارتداد کا سبب اس وقت بنتا ہے جب اس کا انکار رسالت کے انکار کا باعث ہو لیکن بعض فقیہ اس شرط کو لازم نہیں جانتے ہیں؛ اور کہتے ہیں کہ اسلام کے واضحات کا انکار، مطلق طور پر ارتداد کا سبب بنتا ہے"۔

دین اسلام کے ظنیات میں اختلاف اور اس کی وضاحت

اب یہ بات واضح ہوگئی کہ اسلام کے جو احکام وعقائد واضح اور قطعی ہیں ان میں کوئی بھی اختلاف نہیں ہے اور ان میں کوئی شک وشبہہ نہیں پایا جاتا ہے اور جو کوئی بھی ان کو قبول نہ کرے وہ مسلمان نہیں ہے۔ بعض احکام اسلام میں ایسے پائے جاتے ہیں جو کہ ظنّی ہیں، اسلام کے جو احکام ظنی ہیں ان کے بارے میں اہل نظر اور مجتہدین ممکن ہے الگ الگ نظریہ اور فتوٰی رکھتے ہوں اب جو لوگ مجتہد نہیں ہیں عقلی اور نقلی دلیل کی بنیاد پر ان کا وظیفہ یہ ہے کہ مجتہدین کی طرف رجوع کریں اور ان کی تقلید کریں، تقلید کا مطلب ہے غیر متخصّص کا متخصّص (اس فن کے ماہر) کی طرف رجوع کرنا جو کہ ایک عام قاعدہ ہے اور صرف دینی مسائل اور احکام سے متعلق نہیں ہے بلکہ ہر میدان اور شعبہ میں جو شخص نہیں جانتا وہ جاننے والے کی طرف رجوع کرتا ہے مثلاً اگر آپ بیمار ہیں تو بیماری اور اس کی تشخیص کے لئے ماہر ڈاکٹر کی جانب رجوع کرتے ہیں، دینی احکام میں بھی لوگ متخصّصین و ماہرین جو کہ مراجع

عظام ہیں، ان کی جانب رجوع کرتے ہیں؛ اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے البتہ یہ طبعی اور فطری امر ہے کہ جب مراجع تقلید کے فتوے مختلف ہوتے ہیں تو جو لوگ ان کی تقلید کرتے ہیں ان کے عمل میں بھی اختلاف ہوتا ہے؛ لیکن اس بات کی طرف توجہ رکھنی چاہئے کہ مراجع عظام کے فتووں میں اختلاف ڈاکٹروں کے نسخوں میں اختلاف جیسی بات ہے؛ اگر دو ڈاکٹر کسی ایک بیمار کے بارے میں الگ الگ تشخیص رکھتے ہوں تو اگر دونوں غلطی پر نہیں ہیں تو کم سے کم ایک ضرور غلطی پر ہے؛ اسی طرح سے ایک ڈاکٹر کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر اس کے تمام نسخوں میں غلطی نہ ہو تو کم سے کم سیکڑوں نسخوں کے درمیان ایک میں غلطی ضرور ہوگی، مراجع تقلید بھی اگر کسی مسئلہ میں الگ الگ نظریہ رکھتے ہوں تو اگر سب کے نظریات غلط نہ ہوں تو یقینی طور پر کسی ایک کا نظریہ صحیح ضرور ہوگا اور بقیہ کا غلط ہوگا؛ اسی طرح ایک فقیہ کے سیکڑوں فتوے جو کہ وہ دیتا ہے ایک نہ ایک فتوے میں غلطی کا امکان رہتا ہے، اگر چہ ایسا ہے، لیکن پھر بھی کیا کیا جائے اس کے علاوہ کوئی راستہ بھی نہیں ہے جب ہماری رسائی اور پہونچ معصوم تک نہیں ہے اس کے علاوہ اور کوئی دوسرا راستہ باقی نہیں ہے کیا چند نسخے جو ڈاکٹر لکھتے ہیں ان میں غلطی ہونے کی وجہ سے پوری ڈاکٹری کے شعبہ کو بند کر دیا جائے؟ ظاہرسی بات ہے کوئی بھی عقلمند انسان اس سوال کا جواب ہاں میں نہیں دیگا۔

لہذا اگر اسلام میں پلورالزم سے مراد اسلام کے ظنّیات میں علماء ومجتہدین کے فتووں کا اختلاف ہو تو یہ چیز مسلم اور قابل قبول ہے۔ ظنیات کے حدود میں اہل نظر کے درمیان اختلاف ممکن ہے اور ہر شخص اس مجتہد کے فتوے پر جس کو اس نے اعلم سمجھا ہے عمل کر سکتا ہے

؛اور کسی بھی مجتھد سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آپ کا نظریہ پوری طرح سے غلط ہے؛ چونکہ ہم نے یہ فرض کیا ہے کہ یہ امور ظنی ہیں اور ہم اس کی واقعیت اور حقیقت کو نہیں جانتے ہیں۔ البتہ اظہار نظر میں بھی یہ شرط ہے کہ وہ شخص دینی مسائل میں متخصّصو ماہر اور صاحب نظر ہو؛ ایسا نہیں ہے کہ چونکہ مسئلہ ظنّی ہے لہذا جو کوئی بھی ہو اور تھوڑا بہت بھی جانتا ہو وہ کہنے لگے کہ میرا نظریہ یہ ہے ۔کیا وزارت حفظان صحت کے افراد ہر شخص کو مطب اور دوا خانہ کھولنے اور ڈاکٹری کرنے کی اجازت دیتے ہیں؟ جواب نہیں میں ہوگا۔

بہر حال اگر کوئی اس کا بھی نام پلورالزم رکھے تو ہم کہیں گے کہ ہاں دین اسلام میں بھی پلورالزم ہے؛ لیکن یہ بات یاد رہے کہ کسی نے بھی پلورالزم کی تفسیر اس معنی میں نہیں کی ہے ؛اس لئے کہ پلورالزم یعنی حقیقت یا اس تک پہونچنے کا راستہ متعدد اور الگ الگ ہے، جبکہ ہم نے مجتہدین کے نظریوں میں اختلاف کے متعلق کہا ہے کہ حقیقت اور حکم خداوند عالم فقط ایک ہی ہے اب اگر کوئی مجتہد حکم خداوند عالم کو جو کہ حقیقی حکم ہے حاصل کرلے تو اس کا نظریہ صحیح ہے اور اگر حکم واقعی کے علاوہ اس کا فتویٰ ہے تو یقینی طور پر وہ غلط اور نادرست ہے لیکن اس مقام پر جیسا کہ اس سے قبل کہہ چکا ہوں مرجع تقلید اور اس کے مقلدین اس طرح کے حکم میں معذور ہیں؛ لہذٰا اس کا نام پلورالزم نہیں رکھا جا سکتا۔

خبری باتوں میں پلورالزم کا انکار، اخلاقی اور اقداری مسائل میں اس کا اقرار

دوسری بات جو یہاں پر پائی جاتی ہے وہ یہ کہ قضایائے خبری اور انشائی کے درمیان فرق ہے ۔معرفت شناسی کی بحث میں کہا گیا ہے کہ وہ قضایا کہ جن سے ہمارا علم تعلق رکھتا ہے وہ دو طرح کے ہیں، کچھ وہ قضایائے خبری ہیں کہ میں ان کو" موجود و معدوم" سے تعبیر کیا جاتا ہے، دراصل اخبار کی یہ وہ قسمیں ہیں جو کسی شئے کے موجود ہونے یا نہ ہونے کی خبر دیتے ہیں۔ دوسرے وہ قضایا ہیں اصطلاح میں جن کو" اوامر و نواہی" سے پکارا اور یاد کیا جاتا ہے اور یہ ان قضایا کو شامل ہیں جو کہ کسی بات کے محقق ہونے یا نہ ہونے کی خبروں پر مشتمل نہیں ہیں؛اس طرح کے قضایا کو انشائی کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے جبکہ پہلے والے کو خبری کے نام سے جانا جاتا ہے۔

ممکن ہے کوئی شخص ان قضایا میں کہ جنکے بارے میں خبر دی جارہی ہے صدق و کذب پایا جاتا ہو اور یہ خبریں جھوٹ اور یا سچ پر مشتمل ہوں؛ ان میں کوئی بحث نہ کرے،لیکن قضایائے انشائی کے متعلق کہے کہ ان کی خبریں سچ اور جھوٹ سے متصف نہیں ہوتی ہیں اور ان میں صدق و کذب نہیں پایا جاتا ہے؛جس طرح ہماری موجودہ بحث میں بھی کہا جاتا ہے کہ" دین کے اعتقادی مسائل میں سچ اور جھوٹ، صحیح یا غلط ہونا معنی رکھتا ہے اور ممکن ہے کہ ایک نظریہ کو صحیح اور دوسرا نظریہ جو اس کے مقابل ہے اس کو باطل جانا جائے؛ لیکن جو دینی قضایا اخلاق

اور اوامر ونواہی پر مشتمل ہیں وہ ایسا حکم نہیں رکھتے ہیں؛ یہ قضایا کسی عینی واقعیت اور حقیقت کو کشف نہیں کرتے ہیں تاکہ ہم یہ کہیں کہ ایک نظریہ صحیح ہے اور بقیہ نظریئے باطل ہیں۔ اسلام کی تمام اخلاقی باتیں ااور اس کے احکام وقوانین اسی طرح کے ہیں؛ اس طرح کی عبارتیں اور جملے کہ" نماز پڑھنا چاہئے، جھوٹ نہیں بولنا چاہئے، دوسروں کے حقوق کو غصب نہیں کرنا چاہئے" اور اسی طرح کی دوسری خبریں ایسی نہیں ہیں کہ ہم ان کے بارے میں کہہ سکیں یہ صحیح ہیں یا غلط، جھوٹ ہیں یا سچ، چونکہ یہ ثابت حقیقت کی حکایت نہیں کرتے ہیں تاکہ ہم ان کے مفہوم کو دیکھیں اور ثابت حقیقتوں سے ان کا مقایسہ کریں، اور پھر دیکھیں کہ اگر مطابقت رکھتے ہیں تو ان کو صحیح جانیں اور اگر مطابقت نہیں رکھتے تو ان کو غلط جانیں۔ اصل میں اس طرح کی خبریں صرف ذوق وسلیقہ اور اعتبار وقرارداد کی نشاندہی کرتی ہیں؛ اگر کوئی کہتا ہے کہ ہرا رنگ اچھا ہے اور دوسرا یہ کہتا ہے کہ پیلا رنگ اچھا ہے تو ان دونوں کا یہ کہنا فقط اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ ایک کا ذوق اور اس کی طبیعت سبز رنگ کو پسند کرتی ہے اور دوسرے کی طبیعت اور اس کا ذوق پیلے رنگ کی طرف مائل ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ایک صحیح کہہ رہا ہے اور دوسرا غلط کہہ رہا ہے یا ہرا رنگ حقیقت میں اچھا ہے اور پیلا رنگ واقعاً اچھا نہیں ہے؛ اس مورد میں حقیقت وخطا، صحیح وغلط کی بحث کرنا پوری طرح بے معنی ہے۔

اخلاقی باتوں کے متعلق معرفت شناسی کے اس مبنیٰ کی بنیاد پر ایک ہی چیز میں نسبیت اور مختلف نظریوں کے قبول کرنے کا دروازہ کھل سکتا ہے۔

جس طرح یہ ممکن ہے کہ کہا جائے سبز رنگ اچھا ہے اور زرد رنگ بھی اچھا ہے صورتی رنگ بھی

اچھا ہے اور بنفشی رنگ بھی اچھا ہے یہ اس بات پر معلق ہے کہ کون کس رنگ کو پسند کرتا ہے، دین کے مورد میں بھی کم سے کم اس کے بعض حصّے جیسے احکام اور اس کے اخلاقی مسائل میں ہم اس نظریے کے قائل ہو سکتے ہیں جہاں پر ایسی باتیں ہوں کہ اوامر ونواہی سے تعلق رکھتی ہوں وہاں ممکن ہے کہ زمان ومکان اور افراد کے اختلاف وتعدد کے اعتبار سے ہم بہت سے قابل قبول مختلف نظریوں کو قبول کریں۔

پہلی صدی ہجری میں ایک بات کو لوگ اچھا جانتے تھے لیکن ممکن ہے کہ چودہویں صدی ہجری میں لوگ اسی بات کو خراب اور معیوب سمجھتے ہوں یہ دونوں اپنے اپنے زمانے کے اعتبار سے صحیح ہیں؛ یہ ممکن ہے کہ جاپانیوں کے لئے ایک چیز اچھی ہے تو انگریزوں کے لئے دوسری چیز اچھی ہے اور دونوں باتیں صحیح ہیں۔ جس معاشرہ میں ہم رہتے ہیں اس بات کو جانتے ہیں کہ پوری طرح سے ننگے اور برہنہ ہونا اور اس حالت میں عام لوگوں کے سامنے جانا، ایک برا کام ہے اور لوگ اس کو ناپسند کرتے ہیں؛ لیکن ممکن ہے کہ یہی چیز ایک دن ایک معاشرہ میں ایک عام چیز ہو اور لوگ اسی کو پسند کرتے ہوں اور ننگے رہنا مفید جانتے ہوں؛ یہ سب ایسے مسائل ہیں جو کہ اجتماعی عرف اور اعتبار وقرارداد سے متعلق ہیں اور جو کچھ بھی ہو فرق نہیں کرتا ہے۔ اچھائی اور برائی چاہے اسلام میں ہو یا کسی دوسرے مذہب میں اسی طرح سے ہیں اور یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ وہ احکام واخلاق جو مسیحیت کے ہیں وہ درست ہیں یا اسلام کی باتیں یا بس یہودیت کی تعلیمات صحیح ہیں بلکہ ان میں سے جو جس کو پسند کر لے وہی اس کے لئے صحیح ہے۔

اس بات کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر ہم اعتقادات اور دین کے وہ مسائل جو کہ "موجود و معدوم" پر مشتمل ہیں ان اس میں پلورالزم کو قبول نہ کریں لیکن دین کے احکام اور اخلاقی مسائل میں لازمی طور پر اس کو قبول کریں اور کثرت و تکثر کو مانیں۔

جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا معرفت شناسی کے مسئلہ میں بعض لوگ سبھی انسانی علوم و معارف چاہے کسی بھی شعبہ میں ہوان، نسبی جانتے ہیں لیکن بعض لوگ فقط احکام اور اخلاق کے مسائل میں نسبیت کے قائل ہیں یا سرے سے ہی مفید خبروں اخلاقی باتوں کو سچ اور جھوٹ ہونے یا صحیح اور غلط ہونے کے قابل نہیں جانتے ہیں۔

اب ہم کو اس بات کو دیکھنا ہوگا کہ اخلاقی مسائل میں نسبیت صحیح ہے یا نہیں؟

اخلاق کے دائرہ میں پلورالزم کے نظریہ پر بحث

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ بہت سی چیزیں ایسی پائی جاتی ہیں جن کی اچھائیاں اور برائیاں بدلتی رہتی ہیں؛ کسی زمانے میں اچھی اور کسی زمانے میں بری ہوتی ہیں کسی ماحول میں ایک چیز اچھی ہوتی ہے اور کسی ماحول میں وہی چیز خراب ہوتی ہے اسی طرح ایک چیز بعض حالات کے تحت اچھی ہے اور بعض حالات کے پیش نظر بری ہوتی ہے یہاں تک کہ جھوٹ اور سچ بولنا بھی ایسا ہی ہے ایسا نہیں ہے کہ سچ بولنا ہمیشہ اچھا اور جھوٹ بولنا ہمیشہ خراب رہا ہو اگر چہ "کانٹ" اس بات کا معتقد تھا کہ سچ بولنا ہمیشہ اچھا اور جھوٹ بولنا ہمیشہ برا ہے اور اس میں کوئی بھی استثناء نہیں ہے؛ لیکن ہم سبھی لوگ اس بات کو جانتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے؛ مثلاً اگر

ایک مومن کی جان بچانا اس بات میں منحصر ہو کہ جھوٹ بولیں تو اس جگہ صرف سچ بولنا حرام ہی نہیں ہے بلکہ لازمی طور سے جھوٹ بولنا بھی واجب ہو جاتا ہے؛ تاکہ مومن کی جان بچ جائے، اگر ظالم شاہ کے زمانے میں ساواکی (پولیس والے) آتے اور آپ سے کسی ایک کا پتہ پوچھتے تو کیا آپ سچ بولتے ؟ اور اس صورت میں وہ اس کو جا کر گرفتار کر لیتے اور اس کو زندان میں ڈال دیتے، شکنجہ میں کستے یا پھانسی دیدیتے، یہ بات بالکل واضح اور روشن ہے کہ آپ کو چاہئے تھا کہ ساواکی سے جھوٹ بولتے اور کسی کا پتہ نہ بتاتے، یا مثلاً اسلامی احکام میں یہ دستور ہے کہ اگر کوئی کام مومن کی بے عزتی اور حقارت کا سبب بن رہا ہے تو اس کام کو انجام نہیں دینا چاہئے اس دستور کا نتیجہ یہ ہے کہ مومن کو چاہئے کہ ہر ماحول میں اسی ماحول کے آداب ورسوم کے مطابق عمل کرے (البتہ صرف اسی حد تک کہ شرعی واجبات اور محرمات کے خلاف کوئی عمل نہ ہو) اور ایسا کام جو اس معاشرہ کے آداب ورسوم کے خلاف ہو اور اس مومن کی بے عزتی اور حقارت کا سبب ہو اس کو انجام نہیں دینا چاہئے

بہرحال ان دونمونے کے علاوہ بہت سے ایسے نمونے پائے جاتے ہیں جن سے ظاہری طور پر ایسا لگتا ہے کہ ان کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلام کے خلاقی واجتماعی احکام واصول میں ایک طرح کی نسبیت اور پلورالزم قابل قبول ہے۔ سچ بولنا اور جھوٹ بولنا دونوں باتیں اچھی بھی ہیں اور بری بھی ہیں؛ یہ حالات اور شرائط سے متعلق ہیں اور انھیں پر منحصر ہیں البتہ یہ بات ذہن میں رہے کہ اس بات کا نتیجہ صرف نسبیت ہے شکاکیت ہرگز نہیں یعنی ایسا نہیں ہے کہ ہم شک کرتے ہوں کہ سچ بولنا اچھا ہے یا جھوٹ بولنا؛ اچھا ہے بلکہ ہم یقینی طور پر ہم اس بات کو

جانتے ہیں کہ سچ بولنا ان حالات میں اچھا ہے اور دوسرے حالات میں برا ہے بہرحال بعض لوگ اس طرح کے مواقع اور موارد سے استدلال کرنا چاہتے ہیں کہ اخلاقی نسبیت اسلامی تفکر میں بھی پائی جاتی ہے اور قابل قبول ہے۔لبتہ اس بیان کی وضاحت میں بہت زیادہ علمی اورفنی شرح وتفصیل ہے جو کہ ہماری گفتگو سے خارج ہے۔

یہاں پر جو کچھ بیان کرنا ممکن ہے وہ یہ کہ: حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم ہر جز وقضیہ کے پورے شرائط اور قیود کو نظر میں رکھیں تو تمام قضیے ہمیں مطلق دکھائی دیں گے اور کسی میں کوئی بھی نسبیت نظر نہیں آئے گی۔مثلاً اگر سائنس یا فیزیک کے مسائل میں آپ سے سوال کیا جائے کہ" پانی کس درجہ حرارت میں کھولتا اور پکتا ہے" تو اس کا جواب یہ ہوگا سو درجہ حرارت میں۔اس کے بعد ایک بہت ہی کھارا پانی لیکر آئیں یا پانی کو ایسی جگہ کھولائیں جہاں پر ہوا کا دباؤ زیادہ ہو یا کم ہو تو آپ دیکھیں گے کہ پانی سو درجہ میں نہیں کھولے گا بلکہ سو سے کم یا زیادہ درجہ حرارت میں کھولے گا یہاں پر نتیجہ نسبیت کے سبب نہیں ہے بلکہ آپ نے قضیہ کو دقیق اور صحیح طریقے سے بیان کرنے میں غلطی کی ہے اور اس کو پوری طرح سے تمام شرائط اور قیود کے ساتھ بیان نہیں کیا ہے مکمل اور صحیح نپا تلا قضیہ یہ ہے کہ مثلاً آپ کہیں (پانی اس درجہ حرارت میں جب کہ خالص ہو تو جوش میں آئے گا اور اس خاص درجہ حرارت میں کھولے گا جب کہ ہوا کا دباؤ ہو....) تمام وہ لوگ جو کہ فیزیک اور سائنسی علم سے واقف ہیں وہ اس بات کو جانتے ہیں کہ پانی خاص شرائط کے ساتھ سو درجہ حرارت میں کھولتا ہے لیکن بولنے اور لکھنے میں عام طور سے ایسی غلطی اور مسامحہ کرتے ہیں اور ان شرائط اور قیود کو حذف کر دیتے

ہیں اور مختصراً کہتے ہیں کہ پانی سو درجہ حرارت میں کھولتا ہے اس طرح کے قضایا بہت سے علوم میں پائے جاتے ہیں؛ جیسا کہ پہلے اس بات کی وضاحت کی جا چکی ہے کہ اس طرح کے قضیوں کا ہونا نسبیت یا ان کے کلی ہونے کی دلیل نہیں ہے؛ بلکہ مکمل طور سے تمام شرائط اور قیود کے بیان کرنے میں غلطی اور مسامحہ کا نتیجہ ہے؛ اخلاقی قضیے بھی ایسے ہی ہیں اگر کسی بھی قضیہ کو پورے قیود اور شرائط کے ساتھ بیان کیا جائے تو حکم کبھی بھی نہیں بدلے گا؛ اگر کوئی چیز اچھی ہے تو ہمیشہ اچھی رہے گی اگر بری ہے تو ہمیشہ بری رہے گی۔اور جو لوگ یہ دیکھتے ہیں کہ سچ بولنے یا جھوٹ بولنے کا حکم کبھی اچھا یا کبھی برا ہوتا رہتا ہے اور بدلتا رہتا ہے تو وہ صرف اس لئے کہ ہم نے ان کے تمام شرائط اور قیود کو بیان کرنے میں لا پرواہی کی ہے۔

لیکن اخلاقی "پوزیٹویسٹ" اور جو لوگ اخلاق واحکام میں نسبیت کے موافق ہیں وہ کہتے ہیں کہ اگر اخلاقی قضیہ کے تمام قیود اور شرائط کو بیان بھی کر دیا جائے تو بھی ان میں مطلق طور پر اچھائی اور برائی فقط نہیں پائی جاتی ہے بلکہ یہ اچھائی اور برائی ذوق وسلیقہ اور لوگوں کی پسند سے بدلتی رہتی ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ اخلاقی مسائل اصل میں کسی واقعیت اور حقیقت کو ظاہر نہیں کرتے ہیں؛ بلکہ جس طرح پہلے بیان کیا جا چکا ہے یہ سب ہرے رنگ کی اچھائی یا پیلے رنگ کی اچھائی جیسے ہیں؛ اور لوگوں کے ذوق وسلیقہ پر منحصر ہیں کہ جو جیسا پسند کرے اور اس کے پیچھے کوئی حقیقت اور واقعیت پوشیدہ نہیں ہے۔

یہیں پر ایک مبنائی اور اصولی بحث ہمارے اور دوسروں کے درمیان پائی جاتی ہے اور ہم کو اس بارے میں بحث کرنی چاہئے کہ کیا اخلاق واحکام اس معنی کے اعتبار سے کثرت پذیر ہیں

یعنی کیا کسی خاص مسئلہ میں ہم ایسے مختلف حکموں کو صحیح اور حقیقت سمجھیں جو ایک دوسرے کے خلاف اور برعکس ہوں یا یہ کہ قضیہ کے تمام شرائط و قیود کو بیان کریں تو اس کا حکم ہر زمانے اور ہر جگہ میں ایک ہی اور ثابت ہوگا؟

اسلام کے احکام، حقیقی اور واقعی مصلحتوں اور مفسدوں کے تابع ہیں

جو کچھ ہم اسلام کی تعلیمات سے سمجھتے ہیں اور جس بات کا اعتقاد رکھتے ہیں وہ دینی بحث سے قطع نظر کرتے ہوئے عقلی دلیل کے ذریعہ بھی قابل اثبات ہے، وہ اس طرح کہ اخلاق واحکام اور اوامر ونواہی کے متعلق بھی موجودات اور معدومات پر مشتمل اشیاء اور خبری قضیوں کے مانند صرف ایک ہی حقیقت پائی جاتی ہے اور اس اعتبار سے وہ متعدد و تکثر کے قابل نہیں ہیں۔

البتہ بعض ایسی برائیاں یا اچھائیاں ہیں جو کہ قراردادی اور اعتباری ہیں اور وہ حقیقی اور واقعی بنیاد نہیں رکھتیں لیکن تمام اچھائیاں یا برائیاں ایسی نہیں ہیں۔ اخلاقی اچھائیاں اور برائیاں جو کہ اسلام میں معتبر ہیں وہ سب کی سب مصالح اور مفاسد کی تابع ہیں جیسے جھوٹ بولنا اس لئے برا اور ممنوع ہے کہ اس سے لوگوں کا ایک دوسرے سے اعتماد اٹھ جاتا ہے اور نتیجہ میں اجتماعی نظام میں خلل پڑتا ہے اور انسان کے لئے ممکن نہیں ہوتا ہے کہ ایسے ماحول میں زندگی بسر کرے؛ ایک ایسے معاشرہ کو فرض کریں جہاں تمام لوگ جھوٹے ہوں اور عام طور سے

جھوٹ بولتے ہوں ایسی جگہ پر تمام کاموں کا شیرازہ بکھر جائے گا اور زندگی کا نظام درہم برہم نظر آئے گا۔ اجتماعی زندگی کی بنیاد ایک دوسرے پر اعتماد سے قائم ہوتی ہے اگر یہ بات طے ہو جائیکہ جھوٹ عام ہو جائے اور سب کے سب جھوٹ بولیں تو آپ چاہے وہ بیوی ہو یا اولاد، اپنے دوست، اعزا، احباب اور پڑوسی کسی پر بھی بھروسہ نہیں کریں گے اور زندگی ایک دوسرے سے جدا ہو جائے گی اور اسی نا قابل تلافی اجتماعی نقصان کی وجہ سے اسلام نے جھوٹ بولنے سے منع کیا ہے اور جھوٹ کو بہت بڑا گناہ سمجھا ہے اس کے برخلاف سچ بولنا لوگوں کے اعتماد کا سبب بنتا ہے اور لوگ ایک دوسرے پر بھروسہ کرتے ہیں تا کہ لوگ اس سچ کی وجہ سے اجتماعی زندگی میں ایک دوسرے سے فائدہ حاصل کریں۔ اگر طالب علم اور استاد اسکول یا یونیورسٹی میں ایک دوسرے پر بھروسہ نہ رکھتے ہوں مثلاً شاگرد اگر استاد پر اعتماد نہ رکھتا ہو کہ استاد صحیح کہہ رہے ہیں اور جو کتاب میں لکھا ہے وہ صحیح اور حقیقت ہے تو مدرسے کے تمام درس اور یونیورسٹی کے تمام کلاس اور ان کی کتابیں بے فائدہ ہو جائیں گی لہذا سچ اور جھوٹ کی اچھائی اور برائی، مصلحت یا مفسدہ پر موقوف ہیں اور ان پر مترتب ہونے والے مفاسد اور مصالح کے اعتبار اسلام نے سچ بولنے کو اچھا اور جھوٹ بولنے کو برا اور معیوب جانا ہے۔ اس جگہ پر ایک بات کا بیان کرنا ضروری ہے کہ اسلام کی نظر میں صرف وہی مصالح اور مفاسد جو کہ مادیات اور دنیاوی چیزوں سے مربوط ہیں، نہیں ہے بلکہ کچھ ایسے مصالح اور مفاسد بھی پائے جاتے ہیں جو کہ معنوی امور سے مربوط ہیں اور انسان کی اخروی زندگی سے ربط رکھتے ہیں اسلام نے جس اچھائی یا برائی کو بیان کیا ہے اس میں دنیاوی مصالح اور مفاسد

کے علاوہ اخروی اور معنوی مصالح و مفاسد کا بھی لحاظ کیا ہے۔

پلورالزم کی بحث اور اس کا خلاصہ

اس حصہ کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ دینی معارف چاہے وہ عقائد سے متعلق ہوں یا احکام سے ان کا تعلق ہو یا پھر اخلاق کے مسائل ہوں یہ سب کے سب واقعیت کے تابع ہیں، ان سب میں حقیقت فقط ایک ہے اور دین حق فقط ایک ہی ہے اس میں کثرت اور تعدد ممکن نہیں ہے؛ ہاں احکام اور اخلاق سے متعلق امور میں کبھی کبھی اس بات کو دیکھا گیا ہے کہ حکم بدل جاتا ہے؛ مثلاً سچ بولنا کبھی اچھا ہے اور کبھی سچ بولنا برا اور معیوب سمجھا جاتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے موضوع کو پورے قیود و شرائط کے ساتھ نظر میں نہیں رکھا ہے اور ان کو بیان نہیں کیا ہے ورنہ اگر سچ بولنے کو تمام شرطوں اور قیدوں کے ساتھ نظر میں رکھا جائے تو یہ ہمیشہ اچھا ہوگا یا برا ہوگا اور کبھی فلسفہ بھی نہیں بدلے گا۔ فلسفی اور معرفت شناسی کے اعتبار سے بھی اگر دیکھیں تو جیسا کہ ہم نے پہلے بھی بیان کیا ہے کہ پلورالزم کا تفکر پیدا ہونے کی وجہ ان تین وجہوں میں سے ایک وجہ ہو سکتی ہے "پوزیٹوزم" "شکاکیت" اور "نسبیت" اگر منطقی پوزیٹیسٹ کی طرح ہم نے الٰہیاتی اور غیر تجربی قضایا جیسے خدا ہے، یا قیامت پائی جاتی ہے، وغیرہ کے متعلق ہم نے کہا کہ اصلاً یہ باتیں بے معنی ہیں، یا اگر ہم انسانی معرفت میں کلّی طور سے یا صرف اخلاق و احکام کے قضیوں میں نسبیت کے طرف دار ہوں، یا اگر ہم شکّاکیت کی موافقت کریں اور کہیں کہ انسانی معارف میں سے کوئی چیز بھی قطعی اور یقینی نہیں ہے اور ان

تمام چیزوں میں شک وشبہ پایا جاتا ہے تو ان تینوں فلسفی اور معرفت شناسی میں سے ہر ایک کے مبنیٰ اور اصول کے لحاظ سے اس نتیجہ پر پہونچ سکتے ہیں کہ پلورالزم کا وجود ہے اور انسانی معارف (کہ دینی معرفت بھی انھیں میں سے ہے) میں حقیقت کا تکثر قبول کیا جا سکتا ہے۔ اگر چہ ہم نے جیسا کہ آغاز جلسہ میں بھی عرض کیا تھا کہ یہ بات دین اس معنی میں نہیں ہے کہ جو بھی پہلے پلورالزم کا حامی ہوا ہے ایسا نہیں ہے کہ پہلے اس نے پوزیٹوزم، نسبیت یا شکاکیت کو اس نے قبول کیا ہو اور اس کے بعد وہ پلورالزم تک پہونچا ہو؛ بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے پہلے پلورالزم کی طرف رجحان پیدا کیا ہو اور اس نے اس کو پسند کر کے اس کو قبول کر لیا ہو اور اس کے بعد اس کو ثابت کرنے یا اس کی توجیہ کے لئے اس پر دلیل لانے کی کوشش کی ہو، لیکن بہر حال اگر کوئی چاہتا ہے کہ منطقی روش پر چلے تو اس چاہئے کہ شروع میں معرفت شناسی کے ان تینوں مبنیٰ کو قبول کرے، اس کے بعد ان سے نتیجہ نکال کر پلورالزم کو قبول کرے۔ اصل میں اس بات کی طرف متوجہ رہیں کہ منطقی روش اس طرح ہے کہ تمام علمی مسائل، اصولی اور فلسفی مسائل پر منحصر ہیں اور فلسفی مسائل بھی معرفت شناسی کے مسائل پر مبنی اور منحصر ہیں یعنی منطقی نظام کے اعتبار پہلے معرفت شناسی کی بحثیں، اس کے بعد فلسفی بحثیں اور پھر اس کے بعد علمی مسائلؒ قرار پاتے ہیں۔ مثال کے طور پر جس وقت ایک ڈاکٹر یا محقق ایک بیماری کے علاج کے لئے کسی دوا کی تحقیق کرنا چاہتا ہے تو شروع میں وہ فلسفہ نہیں پڑھتا ہے کہ پہلے وہ فلسفہ پڑھے اور فلسفی اصول وقواعد کو دلیل سے ثابت کرے، لیکن اس کی یہ تحقیق ایک فلسفی اصول پر مشتمل ہے، اور وہ اصل علیّت ہے کہ وہ محقق لیبارٹیری (جانچ گھر) میں آ کر

گھنٹوں اپنے وقت کو ایک دوا کی تحقیق کے لئے صرف کرتا ہے کہ یہ دوا کسی خاص مرض کے لئے ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس بات کا اعتقاد رکھتا ہے کہ یہ بیماری خود بہ خود بغیر کسی علت اور سبب کے نہیں آئی ہے؛ اس بیماری کے آنے کا کچھ نہ کچھ سبب ضرور ہے اسی طرح وہ اس بات کا اعتقاد رکھتا ہے کہ ممکن ہے ایسا دوسرا سبب بھی ہو جو اس کے لئے موثر ہو اس سے وہ بیماری دور ہو جائے اور اس مرض کا علاج بن جائے لہٰذا اسی وجہ سے کوئی بھی محقق بغیر اصل علیت (سبب) کو قبول کئے ہوئے تحقیق کے لئے نہیں آگے بڑھتا ہے، لیکن اس گفتگو کا مطلب یہ نہیں ہے کہ شروع میں اس نے فلسفہ پڑھا ہو اور اصل علیت کو اس نے قطعی اور یقینی دلیلوں سے ثابت کیا ہو پھر اس کے بعد وہ جانچ گھر میں تحقیق کے لئے آیا ہو بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اصل علیت کا اعتقاد اس کے دل و دماغ میں دانستہ یا نادانستہ طور پر پہلے سے پایا جاتا ہے۔

دینی پلورالزم (٤)

اس سے قبل کے جلسے میں جیسا کہ میں نے وعدہ کیا تھا کہ اس جلسہ میں اس بات کی وضاحت پیش کروں گا کہ پلورالزم اور لیبرالزم میں کیا ربط ہے اور اس کے بعد جو چند سوال پیش ہوئے ہیں ان کا جواب دوں گا۔

پلورالزم اور لیبرالزم کا رابطہ

"لیبرالزم" اور" پلورالزم" میں رابطہ کی وضاحت کے لئے سب سے پہلے ان دونوں لفظوں کے معنی کو واضح اور معین کیا جائے، پلورالزم کے معانی سے متعلق پچھلے جلسوں میں وضاحت بہت ہی تفصیل سے کی گئی ہے یہاں پر لیبرالزم سے متعلق وضاحت پیش کی جاتی ہے۔

لغت کے اعتبار سے" لیبرالزم" آزادی چاہنے کے معنی میں ہے اصطلاح میں اس کے معنی سے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ" لیبرالزم" ایک طرح کی آئیڈیولوجی ہے جس کی بنیاد پر انسان اپنی مرضی کے متعلق جس طرح چاہے عمل کرے اور جیسے چاہے زندگی بسر کرے، کوئی بیرونی سبب یا شرط اس کے عمل کو محدود نہ کرے؛ مگر یہ کہ اس کا یہ عمل اور اس کی یہ رفتار دوسروں کی آزادی میں مخل ہو اور دوسروں کی آزادی میں رخنہ کا سبب بنے؛ لیبرالزم عام طور سے زندگی کے تین شعبوں اقتصاد، سیاست اور دین وثقافت میں زیادہ بیان ہوتا ہے

"اقتصادی لیبرالزم" اس معنی میں ہے کہ اقتصادی کام کاج اور فعالیت معاشرہ میں پوری

آزادی کے ساتھ ہو اور جو شخص جو انسان جو چیز بنانا یا ایجاد کرنا چاہے اس کو وہ بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کرے اور اس کی خرید و فروخت کرے؛ خلاصہ یہ

کہ اقتصادی لیبرالزم" کی بنیاد پر چاہے وہ اشیاء کا بنانا ہو یا ان کا پیدا کرنا؛ چاہے وہ معدنیات کی چیزیں ہوں یا کھانے پینے کی چیزیں ہوں یا تبلیغ اور پرچار کی، حتیٰ کہ سرمایہ گزاری سے متعلق ہر وہ چیز کہ جو اقتصاد کے زمرے میں آتی ہو ان میں کسی بھی طرح کی کوئی پابندی کوئی محدودیت نہ ہو؛ مگر یہ کہ دوسرے کی آزادی میں رخنہ ہو۔

سیاست کے میدان میں لیبرالزم کے معنی یہ ہیں کہ لوگ انتخاب اور چناؤ کے طریقے اور حکومت کی تشکیل نیز حاکم کی تعیین اور قوانین کے بنانے اور اس کے نفاذ نیز تمام سیاسی امور میں پوری طرح سے بالکل آزاد ہیں اور وہ لوگ اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ جس طرح چاہیں عمل کریں مگر صرف اس بات کا خیال رہے کہ دوسروں کی آزادی میں خلل اور رخنہ نہ پڑنے پائے۔

لیبرالزم کی اصطلاح کبھی ثقافت اور دین و مذہب سے متعلق استعمال ہوتی ہے، سب سے پہلے جس شخص نے دین و مذہب میں لیبرالزم کے لفظ کو استعمال کیا "شلا یر ماخر" ہے اس نے عرف عام میں" پروٹسٹانزم لیبرال" کے لفظ کو استعمال کیا؛ اس کے بعد یہ لفظ" لیبرالزم" کم وبیش دین کے بارے میں استعمال ہونے لگا؛ بہر حال لیبرالزم دینی سے مراد یہ ہے کہ لوگ جس دین کو چاہیں پسند کریں؛ اصل دین اور اس کے احکام کے قبول کرنے یا قبول نہ کرنے میں بالکل آزاد ہیں اور اس کے لئے ان پر کوئی بھی حد بندی اور پابندی نہیں ہونی چاہئے

۔اگر لیبرالزم کو فقط سیاست اور اقتصاد کے میدان میں پیش کریں تو اس صورت میں یہ دینی پلورالزم سے براہ راست کوئی ربط نہیں رکھتا ہے؛ لیکن اگر سیاسی اور اقتصادی لیبرالزم کے علاوہ دینی لیبرالزم کو بھی قبول کرلیں تو اس وقت لیبرالزم اور پلورالزم کے درمیان ربط پیدا ہو جائیگا؛ اور وہ اس طرح کہ انسان ایک دین کو چننے یا اس پر عمل کرنے یا نہ کرنے میں آزاد ہے (یہ دینی لیبرالزم) یہ ہے کہ چند دین کو ان کے حق اور سچ ہونے کے اعتبار سے قبول کرلیا جائے (یہ دینی پلورالزم ہے) اس صورت میں ان دونوں کے درمیان منطقی لحاظ سے جو ربط پایا جاتا ہے وہ عام خاص مطلق ہے] یاد رہے نسبتیں چار طرح کی ہوتی ہیں] تساوی، تباین ،عام خاص مطلق، عام خاص من وجہ" ان میں سے ان دونوں کے درمیان عام خاص مطلق کا رابطہ ہے [دینی پلورالزم ہمیشہ لیبرالزم کا مصداق ہے؛ لیکن ہر" لیبرالزم" دینی پلورالزم کا مصداق نہیں ہے مثال کے طور پر لیبرالزم سیاسی لیبرالزم کا مصداق ہے لیکن دینی پلورالزم کا مصداق نہیں ہے البتہ پلورالزم اگر دوسرے میدانوں میں] جیسا کہ پچھلے جلسات میں اس کی طرف اشارہ ہوا ہے [بھی ہو جیسے پلورالزم سیاسی، اقتصادی اور معرفت شناسی پلورالزم بھی ہو تو اس وقت لیبرالزم اور پلورالزم کے درمیان رابطہ میں فرق ہو جائے گا۔

بہر حال اگر تاریخی سیر سے ہٹ کر ہم دیکھیں گے تو ان دونوں مفہوموں کے درمیان وہی رابطہ ہے جیسا کہ وضاحت کی گئی ہے لیکن تاریخی اعتبار سے اگر دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ ظاہراً" لیبرالزم" کی فکر" پلورالزم" یہاں تک کہ" سیکولرزم" پر بھی مقدم ہے۔

دینی پلورالزم کی پیدائش کے اسباب پر دوبارہ ایک سرسری نظر

پچھلے جلسات میں پلورالزم کے نظریہ کے پیدا ہونے میں جو اسباب وعلل ذکر ہوئے ہیں ان کی طرف اشارہ کیا گیا؛ ان وجوہات میں جن کو ذکر کیا گیا تھا سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ اختلافات دینی کے سبب جو فساد اور خون ریزیاں ہوتی ہیں اس کو دینی پلورالزم کے ذریعہ ختم کیا جا سکتا ہے؛ اور یہ فکر سب سے پہلے مسیحی مذہب میں پیدا ہوئی۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں جب ایک جرمن کشیش "مارٹن لوتھر" نے مسیحی مذہب میں پروٹسٹان فرقے کو ایجاد کیا اور بہت سے عیسائیوں نے اس میں اس کی اتباع اور پیروی کی تو اس کے بعد کاتھولیک اور پروٹسٹان میں بہت ہی شدید لڑائی چھڑ گئی اور یہ سلسلہ جاری رہا اور آج بھی بہت سے ممالک جیسے ایرلینڈ وغیرہ میں یہ فساد ہوتا رہتا ہے؛ اس سے قبل بھی عیسائی مذہب کے دو فرقوں ارٹڈوکس اور کاتھولیک میں جھگڑا پایا جاتا تھا بہت سے مسیحی علماء اور متکلمین نے ان فرقوں کے درمیان جھگڑے کو ختم کرنے کے لئے مسیحیت میں پلورالزم نظریہ کو پیش کیا؛ اور ان لوگوں نے کہا کہ بس صرف مسیحی ہونا نجات کے لئے کافی ہے اور ارٹڈوکس، کاتھولیک، پروٹسٹان وغیرہ میں کوئی بھی فرق نہیں ہے۔

اس کے بعد مسیحیوں اور یہودیوں کے درمیان جو دیرینہ جنگ اور دشمنی پائی جاتی تھی اس کو ختم کرنے کے لئے دینی پلورالزم کا نظریہ پیش ہوا؛ اور اس بات کی کوشش کی گئی کہ یہ دشمنیاں ختم کی جائیں مثلاً مسیحی مناسک و اعمال خاص کر کاتھولیک مذہب میں ایک رسم پائی جاتی ہے جس کو "عشائے ربانی" کہتے ہیں؛ اس کو گویا مسیحیوں کی نماز کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا اس

میں خاص دعا اور ذکر، پڑھا جاتا ہے وہ چیز جو اس پروگرام یعنی" عشائے ربانی" میں پڑھی جاتی تھی یہ تھی کہ یہودیوں پر اس اعتبار سے کہ وہ حضرت مسیح کے قاتل ہیں لعنت کی جاتی تھی ۔جس وقت یہودی خاص طور سے صہیونی لوگ بعض سیاست کے سبب اس بات میں کامیاب ہوئے کہ ان لوگوں نے یورپ میں طاقت حاصل کی تو واٹیکان اس بات پر مجبور ہوا کہ کہ وہ اس بات کا فیصلہ کرے کہ رسمی اور قانونی طور پر اس بات (بعنوان قاتل مسیح یہودیوں پر لعنت)مسیحیوں کی نماز،عشائے ربانی سے حذف کر دیا جائے اور مسیحی علماء نے فتویٰ دیا؛ کہ اب اس کے بعد" عشائے ربانی" کے مراسم میں یہودیوں پر لعنت نہیں کی جائے گی؛اگر چہ کچھ مدت تک عشائے ربانی میں یہودیوں پر لعنت بندرہی لیکن پھر بھی مسیحی، یہودی قوم کو حضرت مسیح کا قاتل سمجھتے رہے یہاں تک کہ شاید آپ نے ان آخری دنوں میں اس بات کو سنا ہوگا کہ پاپ نے اس بات کا حکم دیا ہے کہ مسیحی اس اعتقاد کو اپنے ذہن اور دل سے بھی نکال دیں؛ اور اس کا سبب یہ بیان کیا کہ ہم یہودیوں سے صلح و دوستی کرنا چاہتے ہیں اور اب وہ وقت دور نہیں رہ گیا ہے کہ جناب پاپ سرکاری طور پر مقبوضہ فلسطین (اسرائیل) میں جا کر وہاں یہودیوں کے سر براہوں سے ملاقات کرنے والے ہیں۔

بہر حال آگے چل کر مسیحیوں نے اس سیاست کو دنیا کے تمام مذاہب میں جاری کرنا چاہا؛ اور کہا کہ ہم کسی بھی ملک میں کسی بھی مذہب سے دینی اعتقادات کے مسئلہ میں جنگ وخونریزی نہیں کریں گے اور ہم سبھی مذہب کو قبول کرتے ہیں؛ یہاں تک کہ بہت سے عیسائیوں نے ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے یہ بھی کہا کہ ہم اس بات کو قبول کرتے ہیں کہ اسلام مسیحیت سے

اچھا دین ہے اور کھلے عام اس کا اعلان بھی کیا؛ لیکن کہا کہ بہر حال مسیحیت بھی ایک اچھا دین ہے۔

یہاں تک زیادہ تاکید آپس میں مل جل کر رہنے اور دینی اعتقادات اور مذہبی اختلاف کے سبب جنگ وخونریزی سے پرہیز کرنے پر تھی؛ ہم نے اس بات کی طرف پہلے بھی اشارہ کیا کہ اسلام نے اس طرح کے عملی پلورالزم کو تمام آسمانی مذاہب اور اہل کتاب حتیٰ بعض غیر اہل کتاب کے درمیان قبول کیا ہے اور اس کو رسماً پہچانا ہے اور ان تمام لوگوں کے جان و مال عزت وآبرو کو مسلمانوں کی طرح قابل احترام جانا ہے لیکن جیسا کہ ہم نے اس کی طرف پہلے بھی اشارہ کیا تھا کہ" پلورالزم" فقط عملی پلورالزم میں منحصر نہیں ہے بلکہ اس نظریہ کی معتقدین نے اس کو نظری اور فکری پلورالزم تک وسعت دی ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم کو نہ فقط عمل میں لڑائی جھگڑا نہیں کرنا چاہئے بلکہ نظری اور فکری اعتبار سے بھی اس بات کو قبول کریں کہ تمام دین صحیح اور حق ہیں اور جو کوئی بھی ان میں سے کسی دین کا معتقد ہو اور اس کے دستورات اور احکام پر عمل کرے وہ کامیابی حاصل کرے گا اور اس کا اعتقاد وعمل قابل قبول ہوگا؛ البتہ اس بات کو ہم کس طرح قبول کر سکتے ہیں؟ جب کہ ہم اس بات کو دیکھتے ہیں کہ سارے ادیان میں تناقض اور تضاد پایا جاتا ہے ہم کس طرح ان سبھی کو حق اور صحیح جانیں؟ اس کی مختلف تفسیر پچھلے جلسوں میں میں نے پیش کی اور ان کے بارے میں مفصّل بحث وگفتگو کی یہیں سے میں چاہتا ہوں کہاس جلسہ کی بحث کے دوسرے حصہ کو شروع کروں یہ اسسوال کا جواب ہوگا جو کہ چند جلسہ پہلے پیش کیا گیا تھا۔

ایک عالمی دین کی بنیاد

سوال یہ ہے کہ کون چیز اس بات سے مانع ہے کہ ہم کہیں تمام دینوں میں کچھ چیزیں مشترک پائی جاتی ہیں ہم پہلے ان مشترکات کو پہچانیں پھر ان کو منظّم کر کے ایک عالمی دین کی صورت میں پیش کریں اور کہیں کہ دین کی حقیقت یہی مشترک مجموعہ ہے جو تمام ادیان میں مشترکہ طور سے پایا جاتا ہے اور جو اختلافات ان کے درمیان ہیں وہ فرعی اور ذوق وسلیقہ کا پہلو رکھتے ہیں اور ان کا ہونا اور نہ ہونا اصل دین میں کوئی نقصان نہیں پہونچاتا ہے دین کی اصل یہی مشترکات ہیں اور اختلافات تو شاخ اور پتے کے مثل ہیں جن کو انسان اپنے ذوق اور سلیقے اور پسند کے مطابق اختیار کرتا ہے گویا یہ دینی پلورالزم کی چوتھی تفسیر ہے نظری اور فکری اعتبار سے یہ ان تینوں تفسیر کے علاوہ ہے جس کو ہم نے پہلے جلسے میں پیش کیا تھا یہاں پر اس کی تھوڑی تفصیل اور وضاحت پیش کی جاتی ہے اور اس کی جانچ پڑتال کی جاتی ہے۔

ایک واحد عالمی دین کی تاسیس کی تحقیق

ہماری نظر میں یہ فرضیہ وخیال بھی متن اور مطلب کے لحاظ سے متناقض ہے اور صحیح نہیں ہے علاوہ اسکے یہ نظریہ اپنے ثبوت پر دلیل نہیں رکھتا۔ علمی اور فنی اصطلاح میں یہ خیال ونظریہ ثبوتی اور اثباتی دونوں لحاظ سے قابل قبول نہیں ہے۔

خود نظریہ کے مطلب اور ثبوتی اعتبار سے اعتراض یہ ہے کہ ایسے مشترکات یا تو دینوں کے

درمیان پائے نہیں جاتے یا اگر ان مشترکات کو تلاش کر بھی لیا جائے تو اس قدر پیچیدہ وکلی اور اتنے مختصر ہیں کہ ان کو دین کا نام نہیں دیا جاسکتا، اسکی وضاحت کچھ اس طرح ہے کہ موجودہ جو ادیان یا مذاہب پائے جاتے ہیں؛ ان میں چار مذہب اسلام، مسیحیت، یہودیت، اور زرتشتی کو ہم آسمانی دین جانتے ہیں اور ہم اس بات کا اعتقاد رکھتے ہیں کہ مسیحیت، یہودیت اور زرتشتی مذہب میں بہت سی تحریفات (کمی وزیادتی) ہوئی ہیں اور یہ موجودہ دین خدا کے نازل کئے ہوئے دین کے علاوہ ہیں اور ان میں فرق پایا جاتا ہے؛ بہرحال شروع میں یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ ان چاروں ادیان کے درمیان مشترکات پائے جاتے ہیں کہ جن کو اخذ کیا جاسکتا ہے جیسے ایسا لگتا ہے کہ خداوند عالم کا اعتقاد تمام ادیان میں مشترک ہے لیکن تھوڑا سا غور وفکر کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ ایسا نہیں ہے اور یہاں تک کہ وہ موارد جن میں ایسا لگتا ہے کہ وہ سارے ادیان کا اتفاقی مسئلہ ہیں ان میں بھی بنیادی اختلاف پائے جاتے ہیں؛ مثلاً وجود خداوند عالم کے اصل اعتقاد کے متعلق شروع میں یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ تمام ادیان کا مسلم اور مشترک اصول ہے لیکن اگر تھوڑا سا بھی غور وفکر کریں تو ہمارے لئے اس کے خلاف ہی بات ثابت ہوتی ہے۔

وہ خدا جو کہ مسیحی دین میں پیش کیا جاتا ہے؛ اس کے لئے ممکن ہے کہ وہ انسان کی صورت میں آئے اور سولی پر چڑھے اور دوسرے انسانوں کا فدیہ اور اس کے گناہوں کا کفارہ بن جائے اور ان کی نجات اور چھٹکارے کا سبب بن جائے؛ مسیحیت میں خدا کی اس طرح تعریف کرتے ہیں کہ خدائے پدر، خدائے پسر کی صورت میں حضرت مریم کے بطن میں آیا اور ان

سے پیدا ہوا اور کئی سال تک انسانوں اور مخلوقات کے درمیان اس نے زندگی بسر کی ، یہاں تک کہ اس کو سولی دے دی گئی اور پھر وہ دوبارہ آسمان پر چلا گیا ، یہودیوں کا خدا شاید اس سے بھی عجیب ہو، ان کا خدا ایسا ہے جس کے رہنے کی جگہ آسمان ہے اور کبھی کبھی وہ زمین پر آتا ہے اور تفریح کرتا ہے اور کبھی کبھی اس کو کشتی لڑنے کا شوق ہوتا ہے اور وہ یعقوب پیغمبر سے کشتی لڑتا ہے یعقوب اس کو زمین پر پٹخ دیتے ہیں؛ اور اس کے سینے پر بیٹھتے ہیں مختصر یہ کہ یعقوب اس کے سینے پر سوار رہتے ہیں یہاں تک کہ صبح ہو جائے ؛ خدا کہتا ہے کہ پیارے یعقوب مجھکو چھوڑ دو صبح ہونے والی ہے، لوگ دیکھ لیں گے کہ تم نے مجھے زمین پر پٹخ دیا ہے (اور میری آبرو چلی جائے گی) یعقوب کہتے ہیں : جب تک مجھ کو برکت نہیں دو گے نہیں چھوڑوں گا، خدا بھی یعقوب کے ہاتھوں سے چھٹکارا پانے کے لئے ان کو برکت دیتا ہے تب جا کر یعقوب اس کو چھوڑتے ہیں؛ اور خدا دوبارہ آسمان کی طرف چلا جاتا ہے!!! العیاذ باللہ

درآنحالیکہ اسلام کے مطابق خدا جسم وجسمانیات نہیں رکھتا ہے نہ زمین پر آتا ہے اور نہ آسمان پر جاتا ہے؛ زمین اور آسمان، آج اور کل اس کے لئے برابر ہے اور اس کے لئے کوئی بھی فرق نہیں رکھتا ہے؛ وہ زمین اور آسمان اور زمان ومکان کا پیدا کرنے والا ہے وہ زمانے اور جگہ میں قید ہونے والا نہیں ہے، وہ دیکھنے کے قابل نہیں ہے، تمام مخلوقات اس کے قبضۂ قدرت اور اختیار میں اور اس کی محکوم ہیں، نہ اس کو کسی نے پیدا کیا ہے، اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا ہے، اور جو نامناسب وبیہودہ باتوں کی نسبت یہود ونصاریٰ اس کی طرف دیتے ہیں؛ خداوند عالم ان تمام باتوں سے پاک وپاکیزہ ہے۔

یہ بات بہت ہی واضح ہے کہ ان تینوں خدا میں فقط لفظ اور نام کا اشتراک پایا جاتا ہے؛ ورنہ وجود کے لحاظ سے ان کے درمیان کوئی بھی اشتراک نہیں پایا جاتا ہے اس کی مثال شیر اور شیر کی طرح ہے، پہلا دودھ کے معنی میں ہے اور دوسرا درندے (جانور) کے معنی میں ہے: آن یکی شیر است کہ اندر بادیہ وآن دگر شیر است اندر بادیہ

آن یکی شعر است آدم می خورد
وآن دگر شیر است کہ آدم می خورد

وہ بھی شیر ہے بادیہ (جنگل) کے اندر اور وہ دوسرا بھی شیر ہے بادیہ (پیالے) کے اندر وہ بھی شیر ہے جو آدمی کو کھاتا ہے اور وہ بھی شیر ہے جس کو آدمی کھاتا ہے۔

اگر جنگل کا شیر اور ناشتہ کا شیر (دودھ) ایک ہی ہے تو اسلام اور یہودیت و مسیحیت کا خدا بھی ایک ہی ہے؛ حقیقت میں اسلام کے خدا اور یہودیت و مسیحیت کے خدا میں کون سی مشترک چیز پائی جاتی ہے؟ ایک کہتا ہے کہ خدا جسم رکھتا ہے اور آسمان سے نیچے آتا جاتا ہے جب کہ اسلام کہتا ہے خدا جسم و جسمانیات سے مبرّا ہے؛ "آخر جسم ہے" اور "جسم نہیں ہے" کے درمیان کیسے اشتراک ہوسکتا ہے؟

یہ تو ان محدود ادیان کی بات تھی جن کو ہم نے آسمانی دین میں محصور کیا ہے، لیکن اگر اس سے آگے بڑھ کر دیکھیں جس کو آج کی اصطلاح میں دنیا والے دین کا نام دیتے ہیں؛ تو حالت

اس سے بھی زیادہ خراب نظر آئے گی۔دنیا کا ایک بہت پرانا دین بدھشٹ ہے جسکے ماننے والے بہت زیادہ ہیں بودھ ازم اصلاً خدا کا اعتقادنہیں رکھتے جو کچھ یہ دین کہتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان کو اس دنیاوی و مادی قید وبند اور لگاؤ سے دور رہنا چاہیئے تا کہ وہ بلند و بالا مقام حاصل کر کے کمال پر پہنچ جائے،صرف اسی صورت میں وہ سارے رنج و غم سے چھٹکارا پا سکتا ہے اور مطلق طور پر خوشی اور کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔

اس اعتقاد (خدا نہیں ہے)اور آسمانی ادیان کے نظریہ میں (خدا موجود ہے)کون سی اشتراک کی وجہ ہے؟ جس کو ہم اختیار کریں اور اسکو ایک عالمی دین کے عنوان سے انسانوں کے سامنے پیش کریں؟

اگر اس سے بھی آگے بڑھیں اور" اگوسٹ کانٹ" کی طرح انسان کیخدا ہونے کے قائل ہوں؛تو حالت اس سے بھی بدتر نظر آئے گی،اگوسٹ کانٹ کہتا ہے"ہاں انسان دین چاہتا ہے لیکن وہ دین نہیں جو خدا،پیغمبر،وحی اور ماوراءالطبیعت کی چیزیں رکھتا ہو؛ بلکہ وہ دین جسکا خدا خود انسان ہو،اور پیامبر عقل ہو،تمام موجودات کا محور انسان ہے اور تمام چیزوں کا قبلہ و معبود و مسجود یہی انسان ہے اور تمام ہستی اور عالم وجود کو انسان کی چاہت اور خواہش کے مطابق ہونا چاہیئے۔

اب ہم دوبارہ سوال کریں گے کہ وہ دین جس کا معبود خود انسان ہو یا وہ دین جس کا معبود جسمانی اعتبار سے محدود ہو اور یعقوب کے ہاتھوں گرفتار ہو یا وہ دین جس میں گائے کو پوجا جاتا ہو یا وہ دین جو کہ اصلاً خدا کا اعتقادنہیں رکھتا اور اس کے مقابلہ میں ایک دوسرا دین جس کا

معبود اللہ ہو، جو لامحدود ہے اس کا کوئی ثانی نہیں اور وہ ہمیشہ رہنے والا ہے، اب ان میں کس عالمی اور دنیاوی دین کو اختیار کیا جائے؟ اور اس حالت میں مشترک عالمی دین کی بات کرنا اور اس سلسلہ میں گفتگو کرنا خودساختہ افسانے جیسا ہے ہے جو کہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا ہے؛ اور اس کا کہنے والا مستی کے عالم میں ہے اور بے عقلی سے نزدیک ہے اور عالم عقل و ہوشیاری سے بہت دور ہے] افلا یتد برون [کیا وہ لوگ غور وفکر نہیں کرتے؟ سب سے پہلا اعتقاد جو کہ اصل دین ہے وہ خداوند عالم کا اعتقاد ہے جب ہم اس پہلے ہی قدم پر اتنے واضح تناقضات اور مشکلات سے دوچار ہوتے ہیں اس وقت کیسے ہم ادیان کے درمیانذاتی مشترکات کے وجود کو قبول کریں (اور اختلافات کو عرضی سمجھیں)اور ایک عالمی دین کے عنوان سے اس کا اعلان کریں؟ یقینی طور پر ایسے ہی لا جواب اعتراضات کے موجود ہونے کی وجہ سے بعض ایرانی اہل قلم جو کہ اس نظریہ (عالمی دین کی طرف)رجحان رکھتے ہیں انھوں نے اپنے مضمون میں ×: ذاتی وعرضی دین" عنوان کے تحت دعویٰ کیا ہے کہ خدا کا بھی اعتقاد دین کے لئے جوہری اور ذاتی نہیں ہے؛ بلکہ دین کے عرضیات سے ہے، ممکن ہے کوئی دیندار ہو، لیکن خدا کے وجود کا معتقد نہ ہو! میں عرض کروں گا کہ اگر خدا نہ ہوتو فطری طور سے کوئی پیغمبر بھی نہ ہوگا، جس کو وہ لوگوں کے لئے بھیجے گا؛ لہٰذا انسان کے لئے ممکن ہے کہ وہ خدا اور پیغمبر کا اعتقاد نہ رکھے اس کے باوجود وہ دین بھی رکھتا ہو۔ اسی طرح چونکہ عبادات کے باب میں بھی واضح ہے کہ جو عبادت تمام ادیان میں مشترکہ طور سے پائی جاتی ہو اسکو ہم نہیں رکھتے ہیں؛ اگر چہ مثلاً نماز تمام آسمانی ادیان میں پائی جاتی ہے؛ لیکن اس کی ماہیت اور

طریقے میں پوری طرح سے فرق پایا جاتا ہے؛لہذٰ انہ مشترک خدا باقی رہ جاتا ہے اور نہ مشترک پیامبر و عبادت باقی رہ جاتی ہے۔پس وہ مشترک عناصر سارے ادیان میں کہاں ہیں جن پر ایک عالمی دین کے اعتبار سے ایمان لائیں اور ان کو اختیار کر کے ہم نجات حاصل کرلیں؟

مشترکہ اخلاقی اصول کو ایک عالمی دین کے عنوان سے پیش کرنا

اس بات کے لئے کہ اس نظریہ کا پست اور باطل ہونا اچھی طرح واضح اور روشن ہو جائے،ہم بالفرض قبول کرتے ہیں کہ باوجودیکہ خدا،نبوت اور امامت کے بارے میں ایک مشترک نتیجہ تک نہیں پہونچ سکے لیکن ممکن ہے کہ ایک عالمی دین کو ادیان کے اخلاقی مشترکات کی بنیاد پر پیش کریں،دوسرے لفظوں میں یہ کہا جائے کہ ممکن ہے کوئی کہے کہ ایک عالمی دین اور ادیان کے درمیان مشترکات سے ہماری مراد یہ ہے کہ ایک قسم کے اخلاقی اصول جیسے عدالت اچھی چیز ہے،سچ بولنا،امانت داری،وغیرہ یہ سب اچھی چیزیں ہے جھوٹ بولنا اور ظلم کرنا قبیح اور بری چیز ہے ان باتوں پر تمام ادیان اور ان کے ماننے والے متفق ہیں؛اور یہ تمام مشترکہ اخلاقی اصول ایک عالمی دین ہو سکتے ہیں کہ جس کی ہم کو تلاش ہے لہذا اس نظریہ پر کون سا اعتراض ہوسکتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ سب سے پہلے اس تصوّر کی بنیاد پر دین،اخلاق کے مترادف ہوجائے گا

یعنی دین واخلاق ایک معنی میں ہو جائیں گےاور چند خالص اخلاقی اصول کے مجموعہ کو دین کا نام دینا یہ رائج اصطلاح کے خلاف ہے نیز عرف عام اور عقلاء کے نظریہ سے مختلف ہے؛ تمام لغت میں یہ وضاحت کے ساتھ تصریح کی گئی ہے کہ اخلاق، دین سے اور دین، اخلاق سے جدا اور الگ ہے اور یہ دونوں لفظ الگ الگ معنی میں پائے جاتے ہیں؛ اور کسی بھی لغت اور زبان میں دین و اخلاق کو ایک معنی میں نہیں لیا گیا ہے؛ اس مطلب کی اور زیادہ وضاحت کے لئے کہا جا سکتا ہے کہ بہت سے بے دین اور لا مذہب افراد جو کہ کسی مذہب اور دین کا اعتقاد نہیں رکھتے، ہم ان کو دیکھتے ہیں کہ بہت سے اخلاقی اصول جیسے عدالت، سچ، امانتداری کے اچھے ہونے اور ظلم، خیانت، جھوٹ وغیرہ کے برے ہونے پر اعتقاد رکھتے ہیں اور اس کے پابند ہیں؛ بہر حال سب سے پہلا اعتراض یہ ہے کہ اخلاقی اصول کو قبول کرنے اور دین کے قبول کرنے میں کوئی ملازمہ نہیں ہے اور کسی کے لئے ممکن ہے کہ چند اصول اخلاقی کو قبول کرتا ہو۔ دوسرے یہ کہ لیکن کسی بھی دین و مذہب کا اعتقاد نہ رکھتا ہو؛ اگر ہم اس کو قبول بھی کر لیں کہ خدا، نبوت، قیامت کا اعتقاد اور عبادت وغیرہ کو انجام دینا یہ سب دین کی ماہیت اور شکل میں کوئی دخالت نہیں رکھتے ہیں اور دین فقط چند اخلاقی اصول کا نام ہے، تو اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا دین صرف چند اخلاقی اصول کے اعتقاد کا نام ہے یا اعتقاد کے علاوہ ان اصول پر عمل اور ان کی پابندی کا بھی نام ہے؟ کیا دیندار وہی ہے جو کتاب، مضمون اور تقاریر میں ان اخلاقی اصول کا دفاع اور ان کی حمایت کرے اگر چہ عملی طور پر اان کا پابند نہ ہو، یا اس ایک عالمی دین دیندار اور متدین وہی لوگ ہیں جو کہنے کے ساتھ عمل کے میدان

میں بھی ان اصول کی رعایت و پابندی کرتے ہوں؟ اگر یہ ایک عالمی دین صرف اعتقاد کا نام ہو اور اس پر عمل کرنا ضروری نہ ہو؛ آیا ایسا دین انسان کی زندگی پر کچھ اثر ڈال سکتا ہے؟ ایسے دین کے ہونے یا نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ اگر صرف گفتگو اور زبان سے کہنے کا نام ہے تو ہر ظالم اور خطا کار سچائی، امانت داری اور عدالت کے بارے میں اچھا مضمون لکھ سکتا ہے اور بہترین تقریر کر سکتا ہے؛ کیا دینداری کی حقیقت یہی ہے؟ یہ بات بالکل واضح ہے کہ بغیر عمل کے اعتقاد کا نام دین نہیں ہو سکتا ہے اور ضروری ہے کہ اعتقاد کے علاوہ عمل کو بھی لازم قرار دیا جائے تا کہ اس اصطلاح کے مطابق اس کو دیندار کہنا ممکن ہو سکے۔

یہیں پر ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو شخص خدا، پیغمبر، وحی اور حساب و کتاب کا یقین اور اعتقاد نہیں رکھتا تو کون سی وجہ ہے جو اس کو جھوٹ بولنے سے روکتی ہے، اور کس بات کی ضمانت ہے کہ وہ خیانت نہ کرے اور عدالت کو اختیار کرے؟

ایک بحث جو کہ آخری صدیوں میں سامنے آئی ہے اور بعض لوگوں نے اس کی حمایت کی ہے یہی اخلاق اور دین کے درمیان جدائی کا مسئلہ ہے یعنی بغیر دین کے اخلاق ہونا چاہئے۔ اس نظریہ کی بنیاد پر کہا گیا ہے کہ جو چیز انسان کی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے یہی اخلاق اور اس کے فوائد ہیں؛ دین ہماری زندگی پر کچھ بھی اثر نہیں ڈالتا ہے، لہٰذا ہم اخلاق اور اس کے اصول کو جو کہ مقام عمل میں اثر رکھتا ہے، قبول کرتے ہیں لیکن دین سے کوئی بھی واسطہ نہیں رکھتے ہیں۔ یہی وہ طریقہ فکر ہے جو کہ بعض لوگوں کے ذہن میں پایا جاتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ہم کو انسان ہونا چاہئے اکون سے دین پر ہیں یا اصلاً دیندار ہیں بھی کہ نہیں؟ یہ بات کچھ

اہمیت نہیں رکھتی ہے۔ میں خود اسی تہران میں دو آدمیوں کے درمیان بات چیت کا گواہ ہوں کہ ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا کہ فلاں آدمی بہت اچھا ہے نماز پڑھتا ہے (یعنی نمازی ہے) اس کے دوست نے جواب دیا کہ میرا عقیدہ اور نظریہ یہ ہے کہ آدمی کو اچھا ہونا چاہئے چاہے نمازی ہو یا بے نمازی؛ یہ نظریہ اسی فکر کا نتیجہ ہے جو اخلاق کو بغیر دین کے قبول کرتا ہے ؛اس کی بنیاد پر اچھا ہونا یعنی اخلاقی اقدار کی رعایت کرنا، اچھا ہونا یعنی باادب، باوقار اور سنجیدہ ہونا ہے، دیندار ہونا یا بے دین ہونا یہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ نظریہ صحیح نہیں ہے اور اس نظریہ پر بہت سے اعتراض پیش آتے ہیں ؛جس کی طرف فلسفۂ اخلاق کے مباحث میں تفصیل کے ساتھ اشارہ کیا گیا ہے۔

مثلاً ایک اعتراض یہ ہے کہ فلسفۂ اخلاق کے ایک مکتب فکر اور نظریہ کے مطابق اچھا ہونا لذت آفرینی کے مترادف ہے یعنی ہر وہ چیز جس سے انسان لذّت حاصل کرے وہ اچھی اور پسندیدہ چیز ہے۔ اب اس نکتہ کی جانب توجہ کرتے ہوئے فرض کیجئے کہ بندہ (صاحب کتاب فلسفۂ اخلاق) میں اسی نظریہ کا قائل ہوں اور اس بات کا اور معتقد ہوں کہ اچھا ہونا لذت پہونچانے کے مترادف ہے؛ جس چیز میں لذت زیادہ ہو وہی چیز زیادہ اچھی ہے اور اب اگر جھوٹ بولنے کی وجہ سے مجھ کو لذت حاصل ہو رہی ہو تو کون سی دلیل کہتی ہے کہ میں جھوٹ نہ بولوں؟ ظاہر ہے اس فکری قاعدہ کی بنیاد پر ایسی حالت میں میں جھوٹ ضرور بولوں گا کیونکہ جھوٹ بولنے میں لذت ہے؛ اگر کہیں پر سچ بولنا میرے لئے مصیبت اور رنج و غم کا سبب ہو تو وہاں پر مناسب نہیں ہے کہ میں سچ بولوں اور سچ بولنے کی کوئی دلیل بھی نہیں ہے؛ اسی طرح

ان تمام چیزوں میں جن کو اخلاقی قدر و قیمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور جانتے ہیں اس مبنیٰ اور قاعدہ کی بنیاد پر اس کی رعایت کرنا لازم نہیں ہوگا؛ بلکہ بہت سی جگہوں پر اس اصول اور نظریہ کو پیروں سے روندنا بہتر سمجھا جائے گا کیونکہ اس سے لذت حاصل ہوتی ہے؛ اگر ہم کو چوری، خیانت، رشوت اور ظلم کرنے میں لذت حاصل ہوتی ہو تو یہ ساری چیزیں اچھی ہیں یہ لذت طلبی کے مبنیٰ کا فطری نتیجہ ہے۔

لہٰذا یہ کہ اصول اخلاق کے اس مجموعہ کو جو سبھی کو قابل قبول ہو واحد عالمی دین کے عنوان سے پیش کرنے میں ایک اعتراض ہے کہ کیا واقعاً ایسا مجموعی اصول پایا بھی جاتا ہے یا نہیں؟ اور اس کے علاوہ دوسرا بنیادی اعتراض یہ ہے کہ لوگوں کو کس طرح ان اصول کا پابند کیا جا سکتا ہے؛ اگر خدا، قیامت، اور حساب و کتاب کی بحث نہ ہو تو پھر اپنے کو کیوں ان اخلاقی اصول کے قید و بند میں جکڑا جائے اور انھیں کا پابند رہا جائے؟ حقیقت یہ ہے کہ خدا اور قیامت سے چشم پوشی کی صورت میں کوئی بھی وجہ ان اصول کی رعایت اور ان پر عمل کرنے کے لئے نہیں پائی جاتی ہے: ہاں: یہ ممکن ہے کہ شوق و تنبیہ اور بار بار یاد دلانے اور لازم قرار دینے نیز اجتماعی آداب و رسوم کے ذریعہ بچوں پر اتنا کام کیا جائے کہ ان اصول کی رعایت اور پابندی کرنا ان کے لئے ایک عادت کی شکل اختیار کر لے، لیکن پھر بھی ممکن نہیں ہے کہ ایک قابل استدلال اور منطقی نظریہ کے عنوان سے ان باتوں کا دفاع کیا جائے، یعنی آپ کے لئے ممکن ہے کہ کسی کو ان اخلاق کا پابند کر دیں؛ لیکن آپ کا کام منطقی ہے اس کو کیسے ثابت کیجئے گا ؟ جس طرح سے یہ ممکن ہے کہ شوق، تنبیہ اور مشق و یاد دہانی کے ذریعہ بچوں میں سچ بولنے کا

ملکہ پیدا کر دیں؛ اوران کواس کا عادی بنادیں اسی طرح انھیں وسائل وذرائع سے آپ بچے کو جھوٹ بولنا بھی سکھا سکتے ہیں، اب جب ہمارے لئے ممکن ہے کہ ہم بچوں کے جھوٹ بولنے کو عادت میں تبدیل کر سکتے ہیں تو کیا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جھوٹ بولنا اچھا ہے؟

" کانٹ اس اعتراض سے اچھی طرح واقف تھا اور اس بات کو سمجھ گیا تھا کہ اگر انسان اپنے اعمال کے بدلے ثواب وعذاب کا معتقد نہ ہو تو ان اعمال کو انجام دینے کے لئے اس کے پاس کوئی بھی ضمانت نہیں ہے؛ لہٰذا اگر چہ وہ اس بات کا اعتقاد رکھتا تھا کہ اخلاقی اقدار اور اخلاقی اچھائیاں وہ ہیں کہ ہم کاموں کو صرف ضمیر اور عقل کے حکم کی وجہ سے انجام دیں؛ لیکن اگر ثواب وعذاب کی امید سے ان کو انجام دیں تو ان میں اخلاقی قدر و قیمت نہیں پائی جائے گی؛ پھر بھی وہ کہتا ہے کہ اگر اخلاق چاہتا ہے کہ اس عمل کو انجام دینے کے لئے الگ سے کوئی ضامن ہو تو ہم کو کچھ اصول کو قبول کرنا ہوگا؛ اور وہ تقریباً وہی اصول ہیں جن کو ہم مسلمان قبول کرتے ہیں۔ کانٹ کہتا تھا کہ میں خدا کے وجود اور اسی طرح روح اور انسانی نفس کے ہمیشہ قائم ودائم رہنے کو اسی بات سے ثابت کرتا ہوں۔

چونکہ اگر وہ خدا جو حساب و کتاب رکھتا ہے اور ثواب وعذاب دیتا ہے اس کا اعتقاد نہ رکھیں تو اچھے کام کو انجام دینے کا کوئی سبب نہیں پایا جائے گا؛ اسی طرح اگر انسان کی روح ونفس کے ہمیشہ رہنے کے معتقد نہ ہوں اور کہیں کہ انسان مرنے کے بعد کچھ بھی نہیں رہتا اور جزا وسزا بھی اگر ہے تو صرف اسی دنیا تک ہے پھر بھی ان اصول وقواعد کی رعایت کا کوئی باعث اور سبب نہیں ہوگا اس بنیاد پر اگر چہ کانت معتقد تھا کہ خدا کو برہان نظری سے ثابت نہیں کیا جا سکتا

لیکن وہ کہتا تھا کہ میں عقل عملی کے ذریعہ اس بات کا معتقد ہوں کہ خدا کا وجود ہونا چاہئے تا کہ اخلاق کسی سہارے اور ضمانت کے بغیر نہ رہ جائے۔

گذشتہ بحث کا خلاصہ

اس جلسے کی بحث کا خلاصہ یہ ہوا کہ جولوگ یہ کہتے ہیں کہ ادیان میں اختلافات فرعی اور ذوق و سلیقے کے مطابق ہیں لہذا ہم ان کے مشترکات کولیکر ایک عالمی دین کی شکل میں پیش کریں، ان کے جواب میں ہم کہیں گے کہ سب سے پہلے بنیادی طور پر تمام دین کے اصول خدا، نبوت اور عبادت کے اعمال ہیں اور تحقیق سے یہ معلوم ہے کہ یہ اصول کسی بھی صورت سے تمام ادیان میں مشترک نہیں ہیں۔

دوسرے یہ کہ اگر خدا، نبوت پر اعتقاد اور عبادات کی بات کو چھوڑ دیں اور اس بات کو قبول کریں کہ وہ واحد عالمی دین ان چند اخلاقی اصول کے مجموعہ کا نام ہے جو کہ تمام ادیان میں مشترکہ طور سے پائے جاتے ہیں؛ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا فقط ان اصول کے اعتقاد کا نام دین ہے یا اس کے ساتھ ساتھ عمل کرنا بھی ضروری ہے؟ اگر صرف اعتقاد اور لفظ کا نام دین ہے تو واضح سی بات ہے صرف کہنے سے مسئلہ حل ہونے والا نہیں ہے اور اس پر کچھ بھی اثر نہیں پڑتا ہے بلکہ قول کے ساتھ عمل بھی ضروری ہے، اگر ہم عمل کے بھی قائل ہوں تو سوال یہ ہے کہ خدا، نبوت اور قیامت کا انکار کر کے ان اعمال کو انجام دینے کے لئے کون سی ضمانت پائی جاتی ہے؟ خاص طور پر اس جانب توجہ کرتے ہوئے کہ فلسفہ اخلاق میں دوسرے مکاتب فکر جیسے لذت طلبی وغیرہ والے بھی پائے جاتے ہیں؛ جو کہ اس بات کا اعتقاد رکھتے ہیں کہ اچھے اخلاق

وہ چیزیں ہیں جو کہ انسان کے لئے لذت بخش ہوں جو شخص ایسا اعتقاد رکھتا ہو اس کے لئے سچ بولنا اور سچ بولنے پر اسے مجبور کرنا جب کہ یہ کام اس کے لئے مصیبت اور ناراحتی کا سبب ہو اور جھوٹ، خیانت سے اس کو باز رکھنا جب کہ یہ اس کے لئے لذت بخش ہو، کس طرح ممکن ہے؟ یہ نکتہ بھی پوشیدہ نہ رہے کہ ادیان میں مشترکات نہیں پائے جاتے ہیں، اس بات کے علاوہ اگر تمام ادیان کو نہ بھی کہیں تو کم سے کم بہت سے ادیان ایسے ہیں جو کہ بہت ہی سختی کے ساتھ ایک دوسرے کے اعتقادات کی نفی کرتے ہیں، اور اس کے لئے ایک دوسرے سے جنگ وجدال کرتے ہیں؛ خدا پر اعتقاد کی ہی بات کو لے لیجئے اسلام خدائے وحدہ لا شریک پر اعتقاد کو لازم قرار دیتا ہے اس کے علاوہ شرک یعنی ایک خدا کے علاوہ دوسرے خدا کے انکار کو لازم قرار دیتا ہے؛ بلکہ اسلام کی ابتداء ہی تنہا خدا کے علاوہ دوسرے خداؤں کے انکار سے ہوتی ہے پھر توحید تک بات پہونچتی ہے، سب سے پہلے یہ کہا جاتا ہے لا الہٰ (کوئی خدا نہیں) پھر اس کے بعد ہے الاّ اللہ (سوائے اللہ کے) اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان سب سے پہلے مسیحیت کے تین خدا کا انکار کرے پھر وہ اسلام کی وحدانیت تک پہونچ سکتا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ ادیان کے مشترکات تک پہونچنا انسانوں کے لئے ممکن نہیں ہے۔

بہر حال آخری نتیجہ یہ ہے کہ یہ فرضیہ (واحد عالمی دین) ثبوتی اعتبار سے اور اپنے معنی ومطلب کے اعتبار سے ناممکن ہے۔ اور اثباتی اعتبار سے بھی کوئی دلیل اس کے ثابت ہونے پر نہیں پائی جاتی ہے اور ہمارے نظریہ کے اعتبار سے یہ بات پوری طرح سے مردود اور قابل رد ہے اور ہم اس کو قبول نہیں کرتے۔

اسلام میں جاذبہ اور دافعہ کے حدود (۱)

جس موضوع کے بارے میں گفتگو کی فرمائش کی گئی ہے وہ ہے" اسلام کی نظر میں جاذبہ اور دافعہ کے حدود" ہر موضوع پر گفتگو کرنے یا اس بحث میں داخل ہونے سے قبل ضروری ہے کہ پہلے اس کا موضوع اور عنوان واضح ہوجائے پھر اس کے بعد اس کیمتعلق باتوں کی وضاحت کی جائے۔ یہاں پر سب سے پہلے ہم یہ دیکھیں گے کہ اسلام میں جاذبہ اور دافعہ سے کیا مراد ہے؟ پھر اس کے بعد اس کی حدوں کو معین کریں گے۔

جاذبہ، دافعہ اور اسلام کے مفاہیم کی وضاحت

ہم سبھی لوگ جاذبہ اور دافعہ کے مفہوم سے واقف ہیں؛ ہم جس وقت اس اصطلاح کو سنتے ہیں تو ہمارے ذہن میں عام طور سے وہ جذب اور دفع آتا ہے جو کہ مادی اور طبیعی چیزوں میں بیان ہوتا ہے؛ خاص طور سے آپ اساتید کے لئے جو کہ انجینئرنگ شعبہ سے تعلق رکھتے ہیں معمولاً" نیوٹن" کا عام قانون جاذبہ ذہن میں آتا ہے؛ دافعہ کا مصداق بھی طبیعی علوم میں وہ طاقت ہے جو مرکز سے علیحدہ اور جدا کرنے والی یا وہ دافعہ جو دو ہمنام مقناطیسی قطب کے درمیان پایا جاتا ہے؛ لیکن جب یہ مفہوم انسانی اور اجتماعی علوم میں آتا ہے تو فطری طور سے وہ بدل جاتا ہے اس وقت اس سے مراد یہ طبیعی اور مادی جذب و دفع نہیں ہوتا بلکہ نفسیاتی اور معنوی جذب و دفع مراد ہوتا ہے، یعنی جیسے انسان احساس کرتا ہے کہ کوئی چیز اس کو اپنی

طرف کھینچ رہی ہے اور وہ چاہتا ہے اس کے نزدیک ہو جائے، یہاں تک کہ اگر ممکن ہو تو اس سے مل کر ایک ہو جانا چاہتا ہے، یا اس کے برخلاف بعض انسانوں کو آپ دیکھتے ہیں کہ وہ بعض چیزوں یا بعض لوگوں سے قریب ہونا نہیں چاہتے ہیں، ان کا وجود اس طرح ہوتا ہے کہ وہ ان سے دور رہنا چاہتے ہیں۔اس روحی اور نفسیاتی جذب ودفع کا سبب ممکن ہے ایک مادی چیز، ایک شخص یا ایک عقیدہ یا فکر ونظر ہو۔کبھی کوئی منظر اتنا اچھا اور دلکش ہوتا ہے کہ بے اختیار آپ کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور اگر چہ جسمانی لحاظ سے آپ اس کے نزدیک نہیں ہوتے ہیں اور اپنی جگہ پر کھڑے رہتے ہیں؛ لیکن آپ کی پوری توجہ اور حواس کو اپنی طرف معطوف کر لیتا ہے، اور آپ اس کو دیکھنے میں غرق ہو جاتے ہیں؛ اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کانپھاڑنے والی آواز یا ناقابل برداشت منظر کو دیکھ کر چاہتے ہیں کہ جتنی جلدی ممکن ہو اس سے دور ہو جائیں۔

ایک انسان کی شخصیت کا جاذب ہونا بھی اس معنی میں ہے کہ ظاہری اور جسمانی خصوصیات کے علاوہ اس کے اندر اخلاقی اور روحانی صفات بھی موجود ہوں جو کہ اس کی طرف دوسرے لوگوں کی رغبت اور کشش کا سبب بنیں؛ جو لوگ باادب چال ڈھال رکھتے ہیں اور لوگوں سے خوش اخلاقی سے، ہنستے ہوئے چہرے اور خلوص ومحبت کے ساتھ ملتے ہیں وہ لوگوں کے دلوں میں بس جاتے ہیں اور سبھی لوگ ان کو دوست رکھتے ہیں اور ان کے ساتھ ملنا جلنا اور ان سے قریب رہنا چاہتے ہیں؛ لیکن جو لوگ بے ادب، برے اخلاق کے مالک اور خود خواہ ہوتے ہیں ایسے افراد گویا اپنے کو لوگوں سے دور رکھتے ہیں اور اس بات کا سبب بنتے ہیں کہ لوگ ان

سے دور رہیں ؛لیکن جس وقت جاذبہ اور دافعہ کی بات کسی انسان سے متعلق ہو تو اس بات کی طرف توجہ رکھنی چاہئے کہ اس وقت یہ مسئلہ کلچر اور ماحول کے تابع ہوتا ہے یعنی ممکن ہے کہ بعض خصوصیات کو کسی ایک سماج یا معاشرہ میں اچھی نظر سے دیکھا جاتا ہو لیکن وہی خصوصیات دوسرے معاشرہ میں کسی اہمیت کے حامل نہ ہوں بلکہ انھیں بری نظر سے دیکھا جاتا ہے اب ظاہر ہے کہ جو شخص ان خصوصیات کا مالک ہوگا وہ پہلے معاشرہ کے نزدیک ایک جاذب و پر کشش شخصیت شمار کیا جائے گا نیز لوگوں کی نظروں میں پسندیدہ ہوگا اور لوگ اس کا احترام کریں گے لیکن وہی شخص دوسرے کلچر اور سماج میں معمولی انسان بلکہ قابل نفرت ہوگا ؛ بہر حال میرے عرض کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ایک انسان کی شخصیت میں جو جاذبہ یا دافعہ ہوتا ہے وہ سماج کے ماحول اور تہذیب وثقافت کے اعتبار سے فرق رکھتا ہے۔ بہر حال یہ مسئلہ ایک جداگانہ اور مستقل بحث ہے جس کو اس وقت ہم بیان نہیں کریں گے۔

یہاں تک ہم نے جو توضیحات پیش کیں ان سے جاذبہ اور دافعہ کا مفہوم کسی حد تک روشن ہو گیا ؛لیکن ہماری بحث کا موضوع "اسلام میں جاذبہ اور دافعہ ہے"لہذٰا ہماری مراد "اسلام" سے جو کچھ بھی ہے اس کو واضح ہونا چاہئے ، ہماری نظر میں عقائد اور قواعد و احکام کے مجموعہ کا نام اسلام ہے اس میں اعتقادی اور اخلاقی مسائل بھی اور فردی قوانین اور اجتماعی قوانین بھی شامل ہیں ؛ جس وقت ہم کہتے ہیں کہ اسلام ایسا ہے اور اسلام ویسا ہے تو ہماری مراد اسلام سے یہی اعتقادات اور اس کے قواعد و احکام ہیں ؛ اس بحث میں جب ہم یہ کہتے ہیں" اسلام میں جاذبہ اور دافعہ" تو اس وقت ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ جاذبہ اور دافعہ جو کہ اسلام کے

اعتقادی اور اخلاقی قواعد و اصول میں نیز اس کے تمام احکام قوانین میں پائے جاتے ہیں۔ عقائد کے حصہ میں اسلام کا جاذبہ رکھنا اس معنی میں ہے کہ اسلامی عقائد انسان کی حقیقت پسند فطرت کے موافق ہیں یعنی وہ عقائد جو کہ حقائق ہستی کی بنیاد پر استوار ہیں چونکہ انسان کی فطرت حقیقت کو چاہتی ہے اور یہ عقائد انسانی فطرت کے مطابق ہیں لہذا یہ انسان کے لئے جاذبہ ہو سکتے ہیں۔ بہر حال وہ جاذبہ اور دافعہ جو کہ اسلامی عقائد سے مربوط ہیں فی الحال ہماری بحث میں شامل نہیں ہیں یہاں پر اس جاذبہ اور دافعہ کی بحث زیادہ اہم ہے جو کہ اسلامی احکام اور اخلاق سے مربوط ہیں خاص کر وہ جاذبہ اور دافعہ جو اسلام کے دستوری اور تکلیفی احکام سے مربوط ہیں، اور ہم زیادہ تر اس بات کو دیکھیں گے کہ کیا تمام قواعد و احکام اسلامی انسان کے لئے جاذبہ رکھتے ہیں یا دافعہ؟

کیا اسلام کے بارے میں دافعہ کا تصوّر ممکن ہے؟

ممکن ہے یہ سوال ذہن میں آئے کہ اگر تمام اسلامی معارف و احکام؛ انسانی فطرت اور طبیعت کے مطابق بنائے گئے ہیں لہذا طبعی طور پر اس کے لئے جاذبہ ہونا چاہئے پس اس کے لئے دافعہ فرض کرنا کیسے ممکن ہے؟!

اس کا جواب یہ ہے کہ انسان فطری طور پر حقیقت کا متلاشی اور بلندیوں کا خواہاں نیز اچھی چیزوں کا طالب ہے؛ لیکن اس کے علاوہ بہت سے شہوانی اور فطری امور بھی انسان میں پائے جاتے ہیں کہ بہت سے مقامات پر ان مختلف فطری اور شہوانی امور کے درمیان تزاحم اور

اختلاف پیدا ہوتا ہے یا ایک دوسرے کو دور کر دیتا ہے۔ یا اس بحث کے خلط اور اشتباہ سے بچنے کے لئے دوسرے لفظوں میں یہ کہا جائے کہ انسان کی مادی اور حیوانی خواہشات کو جذبہ شہوت و خواہش کا نام اور اس کی دوسری تمام خواہشوں کو فطرت کا نام دیا گیا ہے، بہت سے مقامات پر فطرت اور خواہشوں کے درمیان ناہماہنگی پائی جاتی ہے، شہوت اور خواہش صرف اپنی تکمیل چاہتی ہے انصاف و عدالت کو نہیں دیکھتی ہے، بھوکا پیٹ آدمی صرف روٹی کھانا چاہتا ہے حلال وحرام، اچھا، برا، اپنا مال ہے یا غیر کا، اس سے اس کو مطلب نہیں ہے چاہے اس کو حلال و جائز روٹی دیں یا حرام و ناجائز اس کو پیٹ بھرنے سے مطلب ہے، انسان کی آرام پسند طبیعت پیسے اور اپنی آرام دہ زندگی کی تکمیل کے پیچھے لگی رہتی ہے یہ پیسہ چاہے حلال طریقے سے حاصل ہو یا حرام ذریعہ سے اس کے لئے سب برابر ہے۔

لیکن انسان کی فطرت انصاف کی طالب اور امانت وعدالت کے موافق ہے نیز حق کو غصب کرنے اور ظلم وخیانت سے بیزار ہے، اس عدالت طلب اور ظلم سے گریز اں فطرت کے بر خلاف کبھی کبھی ایسا دیکھنے میں آتا ہے کہ اپنی خواہشات نفسانی کی تکمیل اور مادی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے صرف خیانت اور ظلم وستم کا سہارا لینا پڑتا ہے؛ یہی وہ مقام ہے جہاں پر انسان اگر حقیقی کمال کو چاہتا ہے تو اس کو مجبوراً ان خواہشات اور لذتوں سے اپنے کو بچانا ہوگا ؛بعض چیزوں کو نہ کھائے، نہ پئے، نہ اوڑھے پہنے، نہ دیکھے اور نہ سنے : خلاصہ یہ کہ اپنے کو محدود ومقید رکھے۔ اسلام بھی انسان کو حقیقی کمالات تک پہونچانا چاہتا ہے؛ لہٰذا ان جگہوں پر فطری پہلو کو اختیار کرتا ہے اور خواہشات نفسانی اور مادی ضروریات کو محدود کرتا ہے؛ ان

مقامات پر جولوگ اپنی خواہشات نفسانی پر کنٹرول نہیں رکھتے ہیں؛ یا دوسرے لفظوں میں یہ کہا جائے کہ حیوانیت ان پر غالب رہتی ہے تو طبعی اور فطری بات ہے کہ بعض اسلامی احکام ان کے لئے جاذبہ نہیں رکھتے ہیں بلکہ دافعہ رکھتے ہیں، اسلام نے ایک مکمل دستور دیا ہے جو کہ فطرت اور خواہش دونوں کے مطابق ہے اور اس مفہوم کی آیات اور روایات بہت کثرت سے پائی جاتی ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ قرآن کریم میں ارشاد فرماتا ہے:

"کلوامن الطیبات مارزقناکم" (۱) یعنی جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تم کو رزق میں دی ہیں ان میں سے کھاؤ پیونیز یہ بھی ارشاد فرماتا ہے:" کلواواشربوا" (۲) کھاؤ اور پیوا یسے احکام اور دستور انسان کے لئے مشکل نہیں رکھتے ہیں لیکن جس وقت اسلام کہتا ہے کہ شراب نہ پیو سور کا گوشت نہ کھاؤ وغیرہ تو یہ دستور ہر ایک کے لئے جاذبہ نہیں رکھتے اور بہت سے ایسے ہیں جن کو یہ احکام اچھے نہیں لگتے۔

....

(۱) سورہ اعراف: آیہ ۱۶۰۔

(۲) سورہ اعراف: آیہ ۳۱۔

اسلامی احکام میں دافعہ کا ایک تاریخی نمونہ

یہاں پر مناسب ہوگا کہ تاریخ اسلام کے ایک واقعہ کی جانب اشارہ کرتا چلوں؛ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ رسول اکرم حضرت محمد کے زمانے میں نجران کے عیسائی رسول کے پاس توحیدی عقائد سے متعلق بحث ومناظرہ کے لئے آئے؛ لیکن علمی بحث میں ان لوگوں کو شکست ہوئی،

اس کے بعد بھی ان لوگوں نے اسلام کو قبول نہیں کیا رسول اکرم نے ان لوگوں کو مباہلہ کی دعوت دی ؛ان لوگوں نے اس مباہلہ کو قبول کیا ؛جس وقت پیغمبر اکرم اپنے محبوب اور سب سے خاص لوگوں یعنی امام علی ،حضرت فاطمہ اور امام حسن و امام حسین کو ساتھ لیکر مباہلہ کے لئے گئے اور نصاریٰ کے علماء کی نگاہ ان پانچ نورانی چہروں پر پڑی ؛تو ان لوگوں نے کہا کہ جو کوئی بھی ان حضرات سے مباہلہ کرے گا اس کے حصّہ میں دنیا و آخرت کی رسوائی اور ذلت ہوگی ؛ لہٰذا وہ لوگ پیچھے ہٹ گئے اور مباہلہ نہیں کیا ؛ان عیسائیوں نے علمی گفتگو میں بھی شکست کھائی اور مباہلہ بھی نہیں کیا لیکن پھر بھی مسلمان ہونے کو تیار نہیں ہوئے اور کہا کہ ہم جزیہ (ٹیکس) دیں گے لیکن عیسائی رہیں گے۔

جب اصحاب نے پیغمبر اکرم سے پوچھا کہ آخر وہ لوگ اسلام قبول کرنے پر تیار کیوں نہیں ہوئے ؟ تو حضرت نے فرمایا: کہ جو عادت اور چاہت ان کو سور کے گوشت کھانے اور شراب پینے کی تھی ،ان چیزوں نے اس سے ان کو مانع رکھا ،چونکہ اسلام نے ان چیزوں کو حرام قرار دیا ہے لہٰذا ان لوگوں نے اسلام کو قبول نہیں کیا

یہ ایک تاریخی نمونہ ہے کہ اسلام کی حقانیت ایک گروہ اور جماعت کے لئے ثابت اور واضح تھی لیکن بعض اسلامی احکام ان کے لئے" دافعہ" رکھتے تھے جو اس بات سے مانع ہوا کہ وہ لوگ اسلام کو قبول کریں ؛یعنی ان کی انسانی فطرت ،حیوانی خواہشات سے مقابلہ کیا ،اس تعارض و ٹکراؤ میں انھوں نے نفسانی خواہشات کو مقدم کیا ۔یہ مسئلہ صرف نجران کے عیسائیوں سے مخصوص نہیں ہے ، بلکہ ان تمام لوگوں سے متعلق ہے جنھوں نے الٰہی اور خدائی تربیت سے

اپنے کومزین اور آراستہ نہیں کیا ہے، یا جولوگ جسمانی اور حیوانی خواہشوں سے مغلوب ہیں۔ وہ احکام اور دستورات جو کہ انسان کے مادی خواہشات کومحدود کرتے ہیں وہ ہی لوگوں کے لئے" دافعہ" ہیں اور جیسا کہ اشارہ ہوا اسلام میں ایسے بہت سے قوانین پائے جاتے ہیں قانوں اسلامی جو یہ کہتا ہے کہ ٤٠ درجہ گرمی میں ١٦ گھنٹے اپنے کو کھانے پینے سے روکے رکھو؛اور روزہ رکھو یہ انسانی خواہشات سے میل نہیں کھاتا، ان کے لئے یہ کام مشکل ہے خاص طور سے نان وائیوں کے لئے (جو کہ روٹیاں وغیرہ پکاتے ہیں) اس لئے کہ وہ مجبوراً آگ کے قریب رہتے ہیں، پھر بھی ایسے بہت سے لوگ ہیں جو کہ چلچلاتی دھوپ یا شعلہ ور آگ کے قریب رہ کر بھی ان احکام پر خوشی سے عمل کرتے ہیں اور روزہ رکھتے ہیں،لیکن ایسے تربیت شدہ بہت کم نظر آئیں گے۔ یا مثلاً خمس ہی کا قانون ممکن ہے ہمارے اور آپ جیسے لوگوں کے لئے کہ شاید سال میں ہزار روپیہ سے زیادہ نہ ہواس ہزار روپے کے نکالنے میں کوئی مشکل اور پریشانی نہیں ہے، ہولیکن جن لوگوں کے ذمہ لاکھوں روپے خمس نکالنا ہوان کے لئے بہت ہی مشکل کام ہے، اسلام کے اوائل میں بہت سے لوگوں نے صرف اسی حکم زکواۃ کی وجہ سے اسلام کو چھوڑ دیا اور رسول کے خلاف ہو گئے؛ اور جس وقت رسول کا ایلچی ان کے پاس زکواۃ لینے کے لئے جاتا تھا تو ان لوگوں نے کہا کہ رسول بھی ٹیکس لیتے ہیں؛ ہم کسی کو بھی خراج اور ٹیکس نہیں دیں گے؛ یہ قانون ان کے لئے دافعہ تھا اور یہی سبب بنا کہ ان لوگوں نے اسلام سے دوری اختیار کر لی یہاں تک کہ اس کی وجہ سے وہ لوگ خلیفہ مسلمین سے جنگ کرنے کو تیار ہو گئے۔

یا مثلاً اسلام جنگ و جہاد کا حکم دیتا ہے یہ فطری بات ہے کہ جنگ میں حلوا، روٹی کھانے کو نہیں ملتی بلکہ مارے جانے، قید ہونے، اندھے ہونے، ہاتھ پیر کٹنے اور دوسرے بہت سارے خطروں کا امکان رہتا ہے، بہت سے لوگ ان خطروں کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں اور حکم جنگ یا میدان جنگ میں جانے کے مخالف ہیں؛ اس کے برخلاف بہت سے مجاہد (سپاہی) ایسے بھی ہیں جو میدان جنگ میں جانے کے لئے ہر طرح سے آمادہ دکھائی دیتے ہیں اور بہت ہی شوق سے ان خطرات کو قبول کرتے ہیں؛ پھر بھی اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ حکم بہت سے لوگوں کے لئے جنھوں نے اپنے کو ایسا نہیں بنایا ہے کوئی جاذبہ نہیں رکھتا ہے؛ اور کسی بھی بہانے سے اپنی جان چراتے ہیں اور اس کام سے فرار اختیار کرتے ہیں۔

لہذا اس سوال کا جواب کہ اسلام کے احکام وقوانین جاذبہ رکھتے ہیں یا دافعہ؟ یہ ہے کہ عام لوگوں کے لئے بعض اسلامی دستورات جاذبہ رکھتے ہیں اور بعض احکام دافعہ رکھتے ہیں۔

عملی میدان میں جاذبہ اور دافعہ کے سلسلے میں اسلامی حکم

اب یہ سوال کہ مسلمانوں کا برتاؤ اور ان کا طور طریقہ آپس میں ایک دوسرے کے متعلق بلکہ غیر مسلمانوں کے ساتھ کیسا ہونا چاہیئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام کی بنیاد جاذبہ پر ہے اور اسلام یہ چاہتا ہے کہ لوگوں اور اسلامی معاشرہ کو سعادت اور کمال تک پہونچائے لہذا اسلامی معاشرہ کا برتاؤ ایسا ہونا چاہیئے کہ دوسرے افراد جو لوگ اس ماحول اور سماج سے باہر زندگی

بسر کر رہے ہیں ان کی جانب متوجہ ہوں اور اسلام ان کے لئے واضح ہو جائے اور وہ لوگ راہ راست پر آ جائیں۔ اگر لوگ اسلامی ماحول اور اسلامی مرکز سے دور رہیں گے تو ان تک اسلام نہیں پہونچایا جا سکتا اور وہ لوگ ہدایت نہیں پا سکتے۔ لہٰذا اہم اور اصل یہ ہے کہ مسلمان ایسی زندگی بسر کریں کہ وہ آپس میں بھی ایک دوسرے سے جاذبہ رکھتے ہوں اور روز بروز ان کے درمیان اپنائیت اور یکجہتی بڑھتی رہے اور غیر مسلم جو کہ اس ماحول سے الگ اور جدا ہوں ان کے متعلق بھی جاذبہ رکھنا چاہیئے تاکہ ان کی بھی ہدایت ہو سکے اگر چہ اسلام کی اصل جاذبہ کی ایجاد پر ہے لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ ہم ہر حالت میں ایک ہی رفتار رکھیں ؛ بلکہ بعض مواقع پر دافعہ کی چاشنی اور مٹھاس سے بھی فائدہ حاصل کرنا چاہیئے۔ اس بات کی وضاحت کے لئے اور اس کو ثابت کرنے کے لئے اس جلسہ میں جو وقت باقی رہ گیا ہے اسی اعتبار سے کچھ باتوں کو پیش کر رہا ہوں اور بقیہ باتوں کو بعد میں عرض کروں گا، ان شاء اللہ۔

جاذبہ رکھنے والے اسلامی کرداروں کے بعض نمونے

مذہب اسلام میں عدل و انصاف، احسان، لوگوں کے ساتھ بہتر سلوک اور لوگوں کو خوش رکھنے کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے ؛ اسلام کی بڑی عبادات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ایک انسان دوسرے کو خوش کرے اور اگر دوسرا غمگین و رنجیدہ ہو تو اس کے رنج و غم کو کسی نہ کسی طرح دور کرے۔ بعض روایتوں میں ایک مومن کو خوش رکھنے اور اس سے رنج و غم کو دور رکھنے کا ثواب سالوں کی عبادت سے بہتر ہے یہاں تک کہ اگر یہ کام صرف اتنا ہو کہ اس کے ساتھ

محبت آمیز برتاؤ کرے یا ایسی بات کہے جس سے اس کو امید ہو جائے اور اس کو سکون دل پیدا ہو جائے مثلاً مومن کو دیکھ کر مسکرانا، اس سے ہاتھ ملانا اور اس کو گلے لگانا، بیماری کے وقت اس کی عیادت کرنا، اس کے کاموں میں اس کی مدد کرنا جو کہ مسلمانوں کے درمیان ہماہنگی دوستی اور جاذبہ کا سبب ہیں ان سارے کاموں کا ثواب اسلامی روایات میں بہت کثرت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے؛ اسلام صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اس کے علاوہ ان میں سے بہت سارے احکام اور دستورات کو غیر مسلموں سے متعلق بھی بتاتا ہے اور اس کے متعلق بہت ہی تاکید کرتا ہے؛ اسلام کہتا ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم تمھارا پڑوسی ہے یا تم اس کے ساتھ سفر کر رہے ہو تو وہ تم پر حق پیدا کر لیتا ہے کہ اگر بیچ راستے سے کسی مقام پر وہ تم سے الگ ہو رہا ہے تو جب وہ اپنے راستے پر جانے لگے تو خدا حافظی کے لئے چند قدم اس کے ساتھ جاؤ اور اس کے بعد رخصت کر کے اس سے جدا ہوؤ اور اپنا راستہ اپناؤ، اسلام عدل وانصاف کی ہر ایک کے ساتھ تاکید کرتا ہے حتیٰ کافروں کے ساتھ بھی؛ نیز کافروں پر ظلم وستم کو ناجائز سمجھتا ہے، اگر کوئی کافر ہے تب بھی تم اس پر ظلم وستم کا حق نہیں رکھتے ہیں:

"ولا یجرمنکم شنٰان قوم علیٰ الاّ تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقویٰ"(۱)

اور خبردار کسی قوم کی عداوت تمھیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ انصاف کو ترک کر دو انصاف کرو کہ یہی تقویٰ سے قریب تر ہے حتیٰ کفّار کے متعلق صرف عدل وانصاف ہی کرنا کافی نہیں ہے بلکہ احسان (اچھا سلوک) جس کا مرتبہ عدل سے بڑھ کر ہے اس کے متعلق بھی خدا کا حکم ہے کہ اس کو بھی کرنا چاہئے، ارشاد ہوتا ہے "لا ینھا کم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم

یخرجوکم من دیارکم ان تبرّوھم وتقسطوا الیھم" (۲) اللہ ان لوگوں کے بارے میں جنھوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ نہیں کی ہے اور تمھیں وطن سے نہیں نکالا ہے اس بات سے تم کونہیں روکتا ہے کہ تم ان کے ساتھ نیکی اور انصاف کرو، بعض موقعوں پر اس سے بڑھ کر حکم دیتا ہے اور فرماتا ہے کہ مسلمان

....

(۱) سورہ مائدہ آیہ ۸.

(۲) سورہ ممتحنہ آیہ ۸.

اسلامی حکومت میں جو ٹیکس دیتے ہیں تو اس ٹیکس میں سے کچھ ان کفار کو دو جو کہ اسلامی حکومت کی سرحد اور اس کے پڑوس میں زندگی بسر کرتے ہوں تا کہ وہ لوگ اسلام کی طرف متوجہ ہوں اور اسلام میں گھل مل جائیں (۱) بلکہ ان کو تھوڑا بہت صرف اس لئے دو تا کہ ان کا دل مسلمانوں کے حوالے سے نرم ہو اور وہ لوگ مسلمانوں پر مہربان ہوں اور ان کے دلوں میں مسلمانوں اور اسلام کی محبت پیدا ہو؛ ایسا سلوک کرنے سے دھیرے دھیرے ایسا ماحول بن جائے کہ وہ زیادہ سے زیادہ تم سے قریب ہوں اور وہ تم سے مانوس ہو جائیں؛ پھر وہ تمھاری زندگی کا قریب سے جائزہ لیں گے اور تمھاری باتوں کو سنیں گے؛ ممکن ہے کہ وہ متاثر ہو کر مسلمان ہو جائیں ؛ایسی مثالیں تاریخ میں کثرت سے پائی جاتی ہیں کہ کفّار مسلمانوں سے رابطہ رکھنے، اسلام کی منطقی باتیں سننے اور پیروان اسلام کی رفتار و گفتار اور ان کی سیرت و اخلاق کا مشاہدہ کرنے کی وجہ سے اسلام کو قبول کرلیا بہر حال یہ چند نمونے تھے جنکو اسلام

نے جاذبہ کے لئے اپنے دستورات اور احکام میں جگہ دی ہے۔

....

(۱) مفہوم سورہ توبہ: آیہ ٦٠۔

کیا اسلام کردار میں ہمیشہ جاذبہ کی تاکید کرتا ہے؟

جس بات کی جانب توجہ دینا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اسلام جس جاذبہ کی سیاست کو اپنانے کا حکم دیتا ہے چاہے وہ مسلمانوں سے متعلق ہو یا کفار سے یہ حکم کلیت نہیں رکھتا ہے؛ بلکہ کبھی کبھی یہی دافعہ کا بھی حکم رکھتا ہے اور اس کو اپنانے کا حکم دیتا ہے؛ کبھی کبھی محبت و احسان، روحی رشد و تکامل اور ہدایت کا سبب نہیں بنتے اس کے برخلاف اس کے مقابل میں ایک دیوار کھڑی کر دیتے کبھی کبھی حیوانی خواہشات اور مادی شہوات کے اثر سے اور دوسرے اجتماعی عوامل یا گھریلو تربیت اور اس جیسے اثرات کی وجہ سے انسان کے اندر ستم گری آوارگی اور درندگی کی عادت پیدا ہو جاتی ہے؛ اور اس حال میں اگر اس کو نہ روکا جائے تو وہ اس بات کا سبب بنتا ہے کہ وہ دھیرے دھیرے اور دن بہ دن برائیوں اور بد بختیوں کی دلدل میں دھنستا جاتا ہے اور اپنی دنیا و آخرت کو تباہ و برباد کر دیتا ہے اس کے ساتھ ساتھ دوسروں کے لئے بھی تکلیف و اذیت اور ان کے حقوق کی بربادی کا سبب بنتا ہے۔

ایسی جگہوں پر خود اپنی اور معاشرہ کی اصلاح کے لئے اس کو متنبہ کرنا چاہیئے تا کہ وہ برائیوں سے باز آ کر اچھائی اور نیکی کے راستے پر واپس آ جائے یعنی اس تنبیہ کے اندر رحمت بھی ہے

اور یہ تنبیہ خود اس کو زیادہ گمراہ ہونے سے بھی روکتی ہے اور دوسروں تک اس کی برائی پہونچنے سے ھی مانع ہوتی ہے۔ البتہ ظاہری تنبیہ چاہے مالی اعتبار سے جرمانہ کی شکل میں ہو، چاہے کوڑے کی سزا ہو یا قتل یا قید یا دوسری اور سزائیں، بہر حال یہ سب انسان کے لئے تکلیف اور زحمت کا سبب ہوتا ہے اور فطری طور پر کوئی بھی اس سے خوش نہیں ہوتا ہے بہر حال اسلام کہتا ہے کہ خاص حالات میں تمھارا سلوک خشونت اور سختی کے ساتھ ہونا چاہئے اور دافعہ رکھنا چاہئے، کیونکہ ہر جگہ پر جاذبہ مطلوب اور پسندیدہ نہیں ہے۔

پچھلی بحث کا خلاصہ

یہاں تک کی گفتگو کا خلاصہ اور نتیجہ یہ ہوا کہ سب سے پہلے ہم نے اسلام میں جاذبہ اور دافعہ کی تعریف بیان کی؛ جیسا کہ ہم نے کہا کہ اسلام میں جاذبہ اور دافعہ ممکن ہے کسی چیز یا انسان یا پھر عقیدہ وفکر سے مربوط ہو، اسلام کے متعلق ہم نے بیان کیا کہ وہ عقیدے اور احکام اور اخلاق کے مجموعہ کا نام ہے جاذبہ اور دافعہ، اسلام میں ان تینوں میں کسی سے بھی مربوط ہوسکتا ہے اس کے بعد اسلام کے احکام وقوانین سے مربوط جاذبہ اور دافعہ کے متعلق بحث کی اس بحث کے ذیل میں ہم نے عرض کیا کہ اسلام میں کچھ احکام ہیں جو کہ لوگوں کو پسند ہیں اور اکثر لوگ اس کی طرف رجحان رکھتے ہیں اور بہت سے ایسے احکام بھی ہیں جو لوگوں کو پسند نہیں ہیں اور اس کی جانب رجحان نہیں رکھتے ہیں اور وہ ان کے لئے دافعہ ہیں عطر لگانا، مسواک کرنا، صاف ستھرے رہنا، اچھا اخلاق، سچّائی، امانت داری، انصاف اور احسان یہ سب ایسی

چیزیں ہیں کہ اسلام ان کا حکم دیتا ہے اور یہ سب لوگوں کے لئے جاذبہ رکھتی ہیں۔روزہ رکھنا، جہاد کرنا ،میدان میں جانا، مالیات جیسے خمس وزکواۃ کا ادا کرنا یہ سب ایسے احکام ہیں جو کہ اسلامی قوانین کے زمرہ میں آتے ہیں لیکن اکثر لوگوں کو یہ سب اچھا نہیں لگتا ہے، اوران کے لئے دافعہ رکھتا ہے؛ اس کے بعد اصل موضوع کو پیش کیا کہ اسلام کا دستور مسلمانوں کے لئے دوسروں کے ساتھ برتاؤ کے سلسلے میں کیا ہے؟

کیا اسلام یہ کہتا ہے کہ مسلمان ہمیشہ ایک دوسرے کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھیں اور مسکرا کر بولیں اور صرف جاذبہ سے استفادہ کریں یا بعض جگہوں پر خشونت وسختی اور دافعہ کا بھی حکم دیتا ہے؟ جو وضاحت ہم نے پیش کی اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی تعلیمات میں دونوں کا حکم ہے اگر چہ ایسے موارد بہت کم ہیں کہ جن میں دوسروں کے ساتھ مسلمانوں کا برتاؤ خشونت آمیز ہو۔لیکن پھر بھی ایسے مواقع پائے جاتے ہیں ان کے نمونے ان شاء اللہ آئندہ جلسوں میں پیش کئے جائیں گے۔

اسلام میں جاذبہ اور دافعہ کے حدود (۲)

اسلام میں جاذبہ اور دافعہ کے بارے میں تین طرح کے سوالات پچھلے جلسے کے مطالب کے ذیل میں اگر ہم جاذبہ اور دافعہ کے حدود کے بارے میں اسلام کے مطابق گفتگو کرنا چاہیں جو کہ تمام جہتوں کو شامل ہو تو اس بارے میں کم سے کم تین طرح سے گفتگو ہوسکتی ہے۔

گفتگو کا پہلا عنوان اور محور یہ ہے کہ ہم بحث اس طریقے سے کریں کہ اصولی طور پر اسلام کے تمام معارف چاہے وہ عقیدہ سے متعلق ہوں یا اخلاق و احکام سے خواہ وہ ایک انسان سے مربوط ہوں یا پورے معاشرے سے عبادتی ہوں یا حقوقی یا سیاسی ہے یا....، یہ مسائل اس بات کا سبب ہوتے ہیں کہ انسان بعض امور کو اپنے اندر جذب کرے اور بعض امور کو دفع کرے وہ امور مادی ہوں یا معنوی؛ اس صورت میں جب ہم کہتے ہیں کہ اسلام جاذبہ رکھتا ہے؛ یعنی اس کے معارف اور احکام اس طرح ہیں کہ وہ انسان کو اس بات پر ابھارتے ہیں کہ وہ ان چیزوں کو اپنے اندر جذب کرے، اور اسلام کے دافعہ کا مطلب یہ ہے کہ وہ انسان کو اس بات پر مجبور کرتے ہیں وہ ان چیزوں سے پرہیز کرے اور ان کو اپنے سے دور رکھے ؛ یہ دافعہ اور جاذبہ کے پہلے معنی ہیں کہ جس کا اسلام میں تصوّر ہے؛ اور اسی کی بنیاد پر سوال پیش کیا جاسکتا ہے، اس کا مختصر جواب بھی یہ ہے کہ ہم چار فرض تصور کریں:

(۱) اسلام صرف جاذبہ رکھتا ہے (۲) اسلام صرف دافعہ رکھتا ہے (۳) اسلام نہ جاذبہ رکھتا

ہے اور نہ ہی دافعہ (٤) اسلام جاذبہ اور دافعہ دونوں رکھتا ہے، کہ ان چاروں میں سچو تھا فرض صحیح ہے۔

دوسرا معنی جو اسلام میں جاذبہ اور دافعہ کے لئے لیا جا سکتا ہے وہ یہ کہ ہم اس بات کے قائل ہوں کہ اسلام کے معارف اور احکام اس طرح ہیں کہ بعض افراد کے لئے جاذبہ رکھتے ہیں اور بعض افراد کے لئے دافعہ رکھتے ہیں، جاذبہ یعنی وہ لوگوں کو اپنی طرف کھیچتے ہیں اور دافعہ یعنی وہ ان کے لئے اسلام سے دوری کا سبب بنتے ہیں یا تمام اسلامی معارف میں بعض عناصر ایسے ہوتے ہیں اور وہ ان کو اپنی طرف کھینچتے ہیں اور بعض عناصر ایسے بھی ہیں جن کو بعض افراد پسند نہیں کرتے ہیں اور ان کے لئے دفع اور دوری کا سبب بنتے ہیں

تیسرے معنی یہ ہیں کہ ہم اس بات کو دیکھیں کہ اسلام غیر مسلموں کو اسلام کی طرف بلانے میں یا وہ لوگ جو کہ مسلمان ہیں انکی تربیت اور رشد وکمال کے لئے کس طریقے کو اپناتا ہے اور کون سے عمل انجام دینے کو کہتا ہے؟ کیا صرف جاذبہ کے طریقے کو اپناتا ہے یا دافعہ کے طریقے کو اختیار کرتا ہے یا دونوں طریقوں کو استعمال کرتا ہے؟

انسان کا تکامل جاذبہ اور دافعہ کا رہین منّت ہے

اس سے قبل کہ ہم ان تینوں معانی پر تفصیلی گفتگو اور بحث کریں اس سوال کو پیش کریں گے کہ انسانکے لئے ایک متحرک مخلوق کے عنوان سے جو کہ اپنے تکامل کے راستے میں ایک مقصد کو نظر میں رکھتا ہے اور اس تک پہونچنے کی کوشش کرتا ہے کیا اصلاً کوئی قوت جاذبہ ہے جو زیادہ

سے زیادہ اور بہتر طریقے سے اس راستے میں اس کی مدد کرتی ہے یا کوئی قوت دافعہ ہے یا دونوں قوتیں پائی جاتی ہیں؟

اس سوال کا جواب زیادہ مشکل نہیں ہے تھوڑے سے غور وفکر اور دقت کر کے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اگر زندہ رہنے والی چیزیں جو کہ دنیا میں پائی جاتی ہیں ان کو دیکھا جائے؛ چاہے وہ حیوان ہوں یا انسان؛ پیڑ پودے ہوں یا کچھ اور؛ سب کے سب جاذبہ اور دافعہ دونوں کے محتاج ہیں؛ ہر زندہ رہنے والی چیز کے لئے سب سے اہم اور پہلی چیز جو اس کے لئے خصوصیت رکھتی ہے، وہ غذا ہے۔ تمام زندہ موجودات اپنے نشونما نیز اپنی زندگی کو باقی رکھنے کے لئے کھانے اور غذا کی احتیاج رکھتے ہیں غذا اور کھانا بغیر جاذبہ کے نہیں ہوسکتا؛ یعنی غذا حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے باہر سے کوئی چیز جسم کے اندر داخل ہوکر جذب ہو جائے اسی طرح ہر چیز کا جذب تمام زندہ موجودات کے لئے فائدہ مند نہیں ہے بلکہ بعض چیزوں کا جذب، زندہ شے کی نشوونما اور اس کے تحرک میں خلل پیدا ہونے کا باعث، اس کے متوقف ہونے، یہاں تک کی اس کی موت کا باعث ہوجاتا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ ان چیزوں کی نسبت دافعہ بھی رکھتا ہوتا کہ ان کو اپنے بدن سے دور رکھے۔ لہٰذا تمام زندہ موجودات اپنے وجود کے باقی رکھنے کے لئے اور اپنے رشد وکمال کے لئے جاذبہ اور دافعہ دونوں کے محتاج ہیں۔ اس جگہ پر جب ہم یہ کہتے ہیں کہ بعض چیزوں کو جذب کرے اور بعض چیزوں کو دفع کرے تو جو بات سب سے پہلے ذہن میں آتی ہے وہ مادی جذب ودفع ہوتی ہے یعنی ہم یہ تصور کرتے ہیں کہ تمام جگہوں پر جو کچھ جذب یا دفع ہے ایک مادی اور محسوس ہونے والی چیز

ہے؛ لیکن ہم کواس بات کی طرف توجہ دینی چاہئے کہ اسلامی معارف کے اعتبار سے انسان کی زندگی صرف اسی بیولوجک اور مادی زندگی تک محدود نہیں ہے ؛ بلکہ انسان ایک معنوی زندگی بھی رکھتا ہے جو کہ روح سے مربوط ہے یعنیا یک وہ زندگی ،نشوونما اور تکامل ہے جو کہ انسان کے جسم سے مربوط ہے اورایک وہ زندگی ،نشوونما اور تکامل ہے جو انسان کی روح سے مربوط ہے۔خداوند عالم قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے:" یا ایھا الذین آمنوا استجیبو اللہ وللرسول اذادعاکم لما یحییکم" (۱) اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو جب خدا اور رسول تم

....

(۱) سورہ انفال آیہ ۲٤.

کوکسی چیز کی طرف بلائیں جو کہ تم کو زندگی بخشنے والی ہو تو تم اس پر لبیّک کہو؛ یہ بات مسلم ہے کہ اس آیہ کریمہ میں خدا نے جن لوگوں کو مخاطب کیا ہے؛ وہ صاحبان ایمان ہیں اور حیوانی زندگی رکھتے ہیں ؛اور رسول کی باتوں کو سنتے ہیں ،تو خدا اور رسول کیوں ان لوگوں کو اس چیز کی طرف بلا رہے ہیں جو ان کو زندگی بخشتی ہو؛ یقیناً یہ حیات جسمانی اور مادی زندگی نہیں ہے بلکہ اس سے دوسری زندگی مراد ہے۔قرآن کریم میں دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے" وماعلمّناہ الشعر وما ینبغی لہ ان ھوالاّ ذکر وقرآن مبین لینذر من کان حےّاً" (۱) ہم نے اس (رسول) کو شعر نہیں سکھایا اور نہ ان کے لئے یہ مناسب ہے یہ صرف نصیحت اور روشن قرآن کے علاوہ کچھ نہیں ہے تا کہ جو زندہ ہوں ان کو ڈرائیں۔اب یہ کہ قرآن اس شخص کی ہدایت کرتا ہے جو زندہ ہے اس کا مطلب کیا یہی جسمانی اور مادی زندگی ہے؟ اگر مراد یہی مادی زندگی ہے تو ایسی زندگی تو

سارے انسان رکھتے ہیں؛ لہٰذا قرآن کو سب کی ہدایت کرنی چاہئے لیکن ہم دیکھتے اور جانتے ہیں کہ قرآن نے ابولہب، ابوجہل جیسوں کی اگر چہ یہ لوگ ظاہری اور جسمانی زندگی رکھتے تھے، کوئی ہدایت نہیں کی اور قران ایسے لوگوں کی ہدایت نہیں کرتا، تو معلوم ہوا کہ اس حیات سے مراد قران میں کوئی دوسری حیات ہے حیات یعنی زندہ دلی، روحی زندگی جو کہ انسان کو" سننے والا کان" دیتی ہے تا کہ خدا کے

....

(١) سوررہ ٰیسین: آیہ ٦٩ اور ٧٠۔

کلام کو سن کر ہدایت حاصل کر سکے" فانّک لاتُسمع الموتی" (١) اے رسول آپ مردوں کو نہیں سنا سکتے، اس آیہ میں مردوں سے مراد" مردہ دل افراد" ہیں اور یہ وہی لوگ ہیں جن کے جسم تو زندہ ہیں لیکن ان کی روحیں مردہ ہیں روح اور دل کی زندگی کی کیا نشانی ہے؟ اس کی علامت اور نشانی، خشیت وخوف الٰہی ہے" انما تنذر الذین یخشون ربّھم بالغیب" (٢) اے رسول! تم صرف انھیں لوگوں کو ڈرا سکتے ہو جو از غیب خدا سے ڈرتے ہیں؛ دل کے زندگی کی نشانی یہ ہے کہ جب ان کو متوجہ کریں اور بتائیں کہ تمھارا ایک خالق ہے اس کا تم پر حق ہے اور اس نے تم کو کسی مقصد کے تحت خلق کیا ہے اور تمھارے اوپر اس نے کچھ ذمہ داری قرار دی ہے تو اسکا دل کانپ اٹھتا ہے اور پھر کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوتا ہے، دل میں خوف خدا اور ایمان آنے کا نتیجہ یہ ہے کہ

''یئوتکم کفلین من رحمته ویجعل لکم نوراً تمشون به" (٣)

یعنی خداوند عالم اپنی رحمت سے تم کو دوہرے حصے عطا فرماتا ہے اور ایسا نور قرار دیتا ہے کہ اس کے سبب اور اس کی برکت سے تم چل سکتے ہو؛ یہ نور، مادی اور محسوس کرنے والا نور نہیں ہے، بلکہ وہی نور ہے جو کہ روح اور دل کی زندگی سے مربوط ہے، ایسی زندگی جس کی طرف خداوند عالم نے قران مجید میں مختلف مقامات پر اشارہ

....

(۱) سورہ روم: آیہ ۵۲۔

(۲) سورہ فاطر: آیہ ۱۸۔

(۳) سورہ حدید: آیہ ۲۸۔

کیا ہے قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے"

فانہا لا تعمی الابصار ولٰکن تعمی القلوب التیّ فی الصدور "(۱)

حقیقت میں آنکھیں اندھی نہیں ہیں بلکہ وہ دل جو کہ سینے میں ہیں وہ اندھے ہیں، مادی اور جسمانی آنکھ زندہ ہے اور دیکھتی ہے، لیکن روحانی اور باطنی آنکھ نہیں رکھتے ہیں، وہ صنوبری دل جو کہ سینے کے اندر دھڑکتا ہے اور زندہ ہے لیکن ایک دوسرا جو دل بھی ہے کہ عیب و نقص اسی میں ہے

" ثمّ قست قلوبکم من بعدذالك فهی کالحجارۃ او اشدّ قسوۃ" (۲)

پھر اس کے بعد تمھارے دل سخت ہو گئے پتھر کی، طرح بلکہ اس بھی زیادہ سخت وہ دل پتھر جیسا بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت ہے کہ کوئی چیز اس میں اثر نہیں کرسکتی ؛ بلکہ وہ پتھر سے بھی

زیادہ سخت ہو چکا ہے

" وانّ من الحجارة لما یتفجّر منه الانہار وانّ منہا لما یشقّق فیخرج منه الماء" (۳)

اور بعض پتھروں سے نہریں نکلتی ہیں اور بعض شگافتہ ہوتے ہیں تو اس سے پانی نکلتا ہے بہر حال قرآن مجید میں ایسی بہت سی آیتیں پائی جاتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن اس جسمانی آنکھ، کان اور دل کے علاوہ حیاتی آنکھ، کان، دل کا قائل ہے، اور جس طرح سے جسم کی زندگی، نشوونما اس کے تکامل کے لئے جذب ودفع کی ضرورت ہے ویسے ہی روحی حیات کو بھی جذب ودفع کی احتیاج ہے۔ جس طرح سے بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو کہ جسمانی زندگی پر اثر ڈالتی ہیں اور اس جسم کے لئے مفید یا مضر ہیں ایسے ہی بہت سے عوامل ایسے بھی پائے

....

(۱) سورہ حج؛ آیہ ٤٦۔

(۲) اور (۳) سورہ بقرۃ آیۃ ٧٤.

جاتے ہیں جو کہ اس روحانی زندگی کے لئے فائدہ مند یا نقصان دہ ہیں۔ جس طرح جسمانی زندگی کئی مرتبے اور درجے رکھتی ہے اور اس میں نقص وکمال، اور شدت وضعف پایا جاتا ہے، روحانی زندگی بھی اسی طرح کئی درجے اور مرتبے رکھتی ہے؛ روحانی زندگی کا سب سے پہلا درجہ یہ ہے کہ انسان انبیاء کی پہلی دعوت جو ایمان اور توحید سے متعلق ہے اس کو قبول کرے اور اس کو جذب کر سکے۔ البتہ انبیاء کی اس ہدایت کے اثر اور ان کی تعلیمات پر عمل کرنے

کے بعد انسان دھیرے دھیرے روحانی زندگی کے بلند مرتبہ کو حاصل کر سکتا ہے؛ اسی جگہ پر تزکیہ وتہذیب نفس کی بحث آتی ہے۔

تزکیہ نفس یعنی روح کے کمال کے لئے لازمی جذب اور دفع

نفس کو پاک وصاف کرنے (تزکیہ نفس) کی بحث اصل میں وہی" روح سے مربوط جذب و دفع" بحث ہے۔ ایک درخت کے لئے جب یہ چاہیں کہ وہ خوب تناور اور پھولے پھلے تو ضروری ہے کہ وہ مٹی اور ہوا سے مواد کو جذب کرے اور اس کی چھٹائی کی جائے اور مضر نباتی زہروں اور آفتوں کو اوسے دور رکھا جائے۔ اور یہ دونوں چیزیں یعنی جذب و دفع ضروری ہے ؛انسان کے لئے بھی یہ چیزیں ضروری ہیں یعنی وہ ایسا کام کرے کہ اس کی روح صیقل ہو۔ اس کا مقدمہ یہ ہے کہ وہ چیزیں جو انسان کی روح اور زندگی کے لئے ضروری اور مفید ہوں ان کو جذب کرے اور وہ چیزیں جو انسان کی روح کے لئے مضر اور نقصان دہ ہیں اس کو اپنے سے دور کرے، لہٰذا سب سے پہلا قدم یہ ہے کہ انسان ان چیزوں کو پہچانے اور ان کی معرفت حاصل کرے اور غفلت و جہالت سے باہر آئے؛ انسان کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اس کی روح ایسی ہے کہ" بذکر اللّٰہ تطمئنّ القلوب")١(خداوند عالم کے ذکر سے دلوں کو سکون حاصل ہوتا ہے، روح کی غذا خدا کا ذکر اور اس کی یاد ہے، دل کی زندگی اور خدا کی یاد کے درمیان ربط پایا جاتا ہے؛ یہی دل ایسا ہے کہ اگر اس کی حفاظت نہ کی جائے،

....

(۱) سورہ رعد: آیہ ۲۸۔

اوراس کو آفتوں اورزہریلے گناہوں سے نہ بچایا جائے اوران کو دل سے دورنہ کیا جائے ؛تو ایسا بگڑ جاتا ہے کہ خداوندعالم اس بیزار ہوجاتا ہے قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:" واذا ذکر اللہ وحدہ اشمازت قلوب الذین لا یومنون بالآخرۃ" (۱) اور جب ان کے سامنے خدائے یکتا کا ذکرآتا ہے تو جن کا ایمان آخرت پرنہیں ہے ان کے دل متنفر ہوجاتے ہیں ؛ اگرچہ خدا کو پہچاننا اوراس کی معرفت حاصل کرنا ہرانسان کی فطرت میں داخل ہے ؛اورانسان کی طبیعت اولیٰ اس طرح بنائی گئی ہے کہ وہ خدا کو دوست رکھتی ہے اوراس کو پہچانتی ہے لیکن برائیاں اور غلط کام اس کو اس طرح خراب کردیتے ہیں کہ جب خدا کا نام آتا ہے تو وہ ناخوش ہوجاتے ہیں۔جس طرح انسان کی پہلی طبیعت اس طرح بنی ہے کہ جب دھواں اس کے حلق اور پھیپھڑے میں جاتا ہے تو وہ تکلیف محسوس کرتا ہے اورفطری طور پراس کی وجہ سے کھانسنے لگتا ہے لیکن جب سگریٹ پینے کا عادی ہوجاتا ہے اوراپنے جسم کوایسا عادی بنالیتا ہے کہ جب تک سگریٹ کا دھواں اپنے حلق میں نہیں ڈال لیتا اس کو آرام اورسکون نہیں ملتا ہے حتیٰ اگر سگریٹ پئے بھی رہتا ہے اوراس کا اس سے دل بھی بھرا رہتا ہے لیکن صرف اس وجہ سے کہ سگریٹ گھر میں نہیں ہے تو اس کو نیند نہیں آتی ہے ؛وہی تلخ اور کڑوا دھواں جو کہ پہلی فطرت کے خلاف تھا اوراس کو تکلیف دیتا تھا اب اس کی عادت کی وجہ سے اس کا مزاج ایسا بدل گیا ہے کہ وہی

....

(۱) سورہ زمر: آیہ ٤٥۔

دھواں اس کی زندگی کا حصّہ بن گیا ہے اور اس سے ایسی وابستگی ہوگئی ہے کہ اس کے بغیر اس کو نیند نہیں آتی ہے۔

منجملہ ان چیزوں کے جو انسان کی معنوی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہیں خداوند عالم کی محبت، اس کے دوستوں کی محبت، اس کے دوستوں کے دوستوں کی محبت ہے کہ جن کو اپنے اندر پیدا کرنے کے لئے انسان کو کوشش کرنا چاہیئے؛ اس کے برخلاف گناہ، شیطان اور دشمنان خدا اور دشمنان دین کی محبت کو اپنے دل سے نکالنے کی سعی کرنی چاہیئے۔ انسان کی معنوی زندگی کے لئے صرف گناہ ہی نہیں بلکہ گناہ کا تصوّر بھی نقصان پہونچانے کا سبب بنتا ہے؛ اگر مومن یہ چاہتا ہے کہ اس کا ایمان مکمل ہو اور اس کی روح بلند سے بلندتر ہو تو اس کو اپنے ذہن میں گناہ کا خیال بھی نہیں لانا چاہیئے؛ شاید یہ بات ہمارے زمانے اور دور میں] کیونکہ ہمارا ماحول ایسا ہے [افسانہ لگتی ہو اور اس کا تصور بھی کرنا ہمارے لئے مشکل ہو تصدیق تو بعد کی بات ہے ؛لیکن یہ بات واقعیت اور حقیقت رکھتی ہے؛ اگر چہ میں ان بعض داستانوں پر جو لوگ بیان کرتے ہیں ذاتی طور سے یقین نہیں رکھتا اور عام طور پر میری عادت بھی نہیں ہے کہ میں بحث کو قصّہ اور کہانی سے ثابت کروں لیکن پھر بھی کبھی کبھی ذہن کو مطالب سے قریب کرنے کے لئے بعض داستانوں کا نقل کرنا مفید ہوتا ہے لہٰذا میں انھیں داستانوں میں سے ایک کو یہاں پر نقل کررہا ہوں جو کہ اس سے (بحث) مربوط ہے۔

روحی جذب و دفع کا ایک عالی نمونہ

یہ داستان سید رضی اور سید مرتضیٰ سے متعلق مشہور ہے یہ دونوں بھائی تھے سید رضی وہی ہیں جنھوں نے نہج البلاغہ کو جمع کیا ہے؛ سید مرتضیٰ بھی صف اول کے علماء سے ہیں اور بہت بڑی شخصیت کے مالک ہیں، جب ان دونوں بھائیوں نے پہلی مرتبہ اپنے استاد شیخ مفید کے پاس جانا چاہا مرحوم مفید نے اس سے پہلے رات کو خواب میں دیکھا کہ جناب فاطمہ زہرا صلوات اللہ علیھا اپنے دونوں فرزند امام حسن اور امام حسین کا ہاتھ پکڑے ہوئے آئی ہیں اور فرماتی ہیں کہ یا شیخ علّمھما الفقہ یعنی اے شیخ ان کو فقہ کی تعلیم دو شیخ خواب دیکھ کر اٹھے تعجب کیا یہ کیا ماجرا ہے؟ میری کیا حیثیت ہے کہ میں امام حسن اور امام حسین کو تعلیم دوں، صبح ہوئی اور درس کے لئے مسجد گئے ابھی درس دے ہی رہے تھے کہ ایک معظّمہ خاتون کو دیکھا دو بچوں کا ہاتھ پکڑے ہوئے تشریف لائیں اور فرماتی ہیں یا شیخ علّمھما الفقہ اے شیخ! ان دونوں کو فقہ کی تعلیم دو یہ دونوں بچّے کوئی اور نہیں بلکہ وہی سید رضی اور سید مرتضیٰ تھے۔ بہر حال میرا مقصد یہ واقعہ ہے جیسا کہ لوگوں کا بیان ہے: ایک دن ان دونوں بھائیوں نے سوچا جماعت سے نماز پڑھی جائے؛ مستحب ہے کہ امام جماعت ماموم سے افضل ہو اور یہ دونوں بھائی علم کے اس بلند درجے پر فائز تھے کہ نہ صرف واجبات بلکہ مستحبات پر بھی عمل کرتے اور محرمات کے ساتھ مکروہات سے بھی پرہیز کرتے تھے: سید مرتضیٰ چاہتے تھے کہ اس مستحب (جماعت سے نماز پڑھنے) پر بھی عمل کریں دوسری جانب واضح اور صریحی طور پر اپنے بھائی سے یہ کہہ نہیں

سکتے تھے کہ اے بھائی ! میں تم سے افضل ہوں لہذٰ ا مجھ کو امام جماعت ہونا چاہئے تا کہ جماعت کا اور زیادہ ثواب ہم دونوں کو مل جائے، لہذا انھوں نے چاہا کہ اشارے میں اپنے بھائی کو اس مطلب کی جانب متوجہ کریں اور کہا کہ ہم میں سے وہ امامت کرے جس سے آج تک کوئی گناہ سرزد نہ ہوا ہو گویا سید مرتضیٰ اشارۃً یہ بتانا چاہتے تھے کہ جس وقت سے میں حد بلوغ کو پہونچا ہوں، تب سے آج تک مجھ سے کوئی گناہ نہیں ہوا ہے؛ لہذا بہتر یہ ہے کہ میں امامت کے فرائض انجام دوں۔ سید رضی نے فرمایا کہ بہتر ہے کہ ہم دونوں سے وہ امام ہو جس نے آج تک گناہ کا خیال بھی نہ کیا ہو، گویا یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب سے میں سن بلوغ کو پہونچا ہوں تب سے میں نے گناہ کا خیال بھی نہیں کیا بہر حال یہ واقعہ کتنی حقیقت رکھتا ہے یہ بات اہم نہیں ہے اہم یہ ہے کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ ایمان کا سب سے بہترین اور بلند درجہ یہ ہے کہ انسان کے ذہن میں گناہ کا تصور بھی نہ آئے۔ قرآن کریم میں خدا وندعالم ارشاد فرماتا ہے:" یا ایھا الذین آمنوا اجتنبوا کثیرا من الظن ان بعض الظن اثم" (۱) اے وہ لوگو! جو کہ ایمان

....

(۱) سورہ حجرات: آیہ ۱۲۔

لائے ہو بہت سے گمانوں سے پرہیز کرو بیشک بعض گمان اور شک گناہ ہیں، لہذٰ ا مومن کو چاہئے کہ برے گمان سے بھی دافعہ رکھتا ہو اور اس گمان کو اپنے سے دور رکھے؛ گناہ کا خیال رکھنا اور اس کے مناظر کو سوچنا اور اس کی فکر کرنا ممکن ہے انسان کے اندر دھیرے دھیرے

وسوسہ کو جنم دے اوراس کو گناہ کی طرف کھینچ لے جائے مومن کو چاہئے کہ ہر حال میں خدا کو یاد رکھے قرآن مجید میں خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:" الذین یذکرون اللہ قیاماً وقعوداً وعلیٰ جنوبھم" (۱) وہ لوگ ہر حال میں چاہے کھڑے ہوں یا بیٹھے یا کروٹ کے بل ہوں خدا کو یاد رکھتے ہیں؛اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلو کے بل لیٹے ہوں یا سونے کے لئے آنکھوں کو بند کر لئے ہوں؛اس حال میں بھی خدا کو یاد رکھو؛اوراس بات کی کوشش کروکہ خدا کی یاد میں تم کو نیند آئے تا کہ تمہاری روح بھی سونے کے عالم میں خدا کے عرش اور ملکوت کی سیر کرے ؛بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جو سونے کے وقت دوسری فکروں کو اپنے ذہن میں لاتے ہیں اوراس سے اپنی فکر کو گندہ کرتے ہیں اور جس وقت سوتے ہیں تو شیاطین کی دنیا کی سیر کرتے ہیں اور خواب بھی گناہ کا دیکھتے ہیں۔

یہ وہ اثرات ہیں جو انسان کی معنوی زندگی میں پیش آتے ہیں۔جس طرح مادی اور دنیاوی زندگی میں انسان اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ اسکا جسم نشوونما کرے

....

(۱) سورہ آل عمران: آیہ،۱۲۵

اور صحیح اور سالم رہے تو اسکو چاہئے کی اچھی غذا کھائے اور خراب وزہریلے کھانے سے جو کہ نقصان دہ ہے پرہیز کرے،اسی طرح روحی زندگی کے شعبہ میں بھی جو چیز اسکی روح کے لئے فائدہ مند ہے اسکو جذب یعنی حاصل کرے اور جو چیز نقصان دہ اور مضر ہے اسکو دفع یعنی دور کرے۔

آیہ "فلینظر الانسان الی طعامہ "(۱) کی تفسیر

یعنی انسان اپنی خوراک اور غذا کی طرف دیکھے، البتہ اس سے پہلے اور بعد کی آیات کے قرینے سے یہ بات کی ظاہر ہوتی ہے کہ یہاں طعام، مادی اور جسمانی غذا سے مربوط ہے، کیوں کہ گفتگو اس انداز سے ہے کہ اے انسان دیکھ یہ غذا کہاں سے آرہی ہے؟ ہم نے پانی کو آسمان سے کیسے نازل کیا، اور کس طرح پودوں اور سبزوں کو اگایا؛ پھر یہ سبزے کس طرح جانوروں کی غذا بنے اور پھر تم کس طرح ان جانوروں کے گوشت سے فائدہ حاصل کرتے ہو؛ یہ سب نعمتیں ہیں جن کو خدا نے تمھارے لئے مہیّا کی ہے؛ خلاصہ یہ کہ آیہ اس بات کی نشان دہی کر رہی ہے کہ ظاہراً یہاں طعام سے مراد جسمانی غذا ہے؛ لیکن اس آیہ شریفہ کے ذیل میں ایک روایت بیان ہوئی ہے جو درحقیقت تاویل کی منزل میں ہے اس آیت کی باطنی تفسیر ہے کہ "فلینظر الانسان الیٰ علمہ من یتّخذ" انسان اپنے علم کو دیکھے کہ وہ کہاں سے حاصل کر رہا ہے؟ کیونکہ علم روح کی غذا ہے اور اس کے مصرف میں انسان کو خاص توجہ دینی چاہیے؛ یعنی جس طرح انسان باہر سے غذا اور کھانا

....

(۱) سورہ عبس: آیہ ۲٤۔

لانا چاہتا ہے تو وہ اس بات کی سعی کرتا ہے اور پوچھتا ہے کہ کون سا ہوٹل صفائی کا زیادہ خیال رکھتا ہے اور کس کا کھانا اچھا اور بہتر رہتا ہے، اس کے بعد وہاں سے غذا حاصل کرتا ہے اسی

طرح علم بھی آپ کے روح کی غذا ہے یہ نہیں ہونا چاہئے کہ جب اور جس سے چاہا علم حاصل کرلیا؛ بلکہ آپ جس استاد سے علم حاصل کر رہے ہیں اس کو دیکھنا چاہئے کیا وہ معنوی اور روحی پاکیزگی رکھتے ہیں یا نہیں؟ ہر وہ علم جو کسی بھی صورت میں پیش ہو چاہے کلاس میں ہو یا کتاب میں، تقریر ہو یا تحریر یا کسی اور طریقہ سے اس پر بھروسہ نہ کریں؛ بلکہ دیکھیں کہ یہ علم کس طرح اور کہاں سے آرہا ہے؛ اس لئے کہ علم کا اثر روح پر، اس غذا کے اثرات سے جو کہ جسم و بدن پر ہوتا ہے کم نہیں ہے؛ جس طرح آپ اس بات کا خیال کرتے ہیں کہ آپ کی جسمانی غذا صاف اور پاک و پاکیزہ ہو؛ پھل، سبزی وغیرہ کو خود آپ دھو کر استعمال کرتے ہیں اور ان چیزوں کو اس کے بعد کھاتے ہیں، علم بھی آپ کی روح کی غذا ہے اس سے بھی باخبر رہیں کہ جو علم حاصل کر رہے ہوں وہ خراب اور آلودہ تو نہیں ہے، اس مقام پر بھی جاذبہ اور دافعہ ضروری ہے۔

وہ چیزیں جو ایمان کو کمزور کرتی ہیں اور ہمارے عقیدہ اور یقین کو متزلزل کرتی ہیں یا ان کے خراب کرنے کا سبب ہیں ان سے ہم کو بچنا چاہئے اور ایسے علم کو حاصل کرنے سے پرہیز کرنا چاہئے اور اس کو حاصل نہیں کرنا چاہئے، مگر صرف اس صورت میں کہ ہمارا علم اتنا مستحکم ہو کہ وہ غلط باتیں ہمارے اوپر اثر نہ ڈال سکیں اور ان کے اثرات سے محفوظ رہنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

جس طرح ٹیکوں اور انجکشن کے ذریعہ ہم اپنے بدن کو بعض بیماریوں سے محفوظ رکھتے ہیں اور انجکشن کا کام یہ ہوتا ہے کہ بیماریوں اور وباؤں کے جراثیم کو ہمارے جسم پر موثر ہونے نہیں

دیتا؛اسی طرح محکم اور متقن دلائل خاص کر اسلامی علوم کو حاصل کر کے ہم اپنی روحانی فکر کو بھی بعض غلط فکروں اور گمراہ کن شبہات سے محفوظ کر لیں تا کہ وہ غلط شبہے اور فاسد فکریں ہمارے اوپر اثر انداز نہ ہوسکیں ؛اگر کوئی شخص مصئونیت اور علمی کمال کے اس درجہ پر پہونچا ہوتو اس کے لئے غلط مطالب کا پڑھنا اور اس طرح کے شبہات کا مطالعہ کرنا حرج نہیں رکھتا ہے؛لیکن جو شخص اس مرتبہ کمال پر نہیں پہونچا ہے اس کو چاہئے کہ ان مطالب سے اپنے کو دور رکھے۔خداوند عالم قرآن کریم میں ارشاد فرما رہا ہے:" اذا سمعتم آیات اللہ یکفر بھا و یستھزا بہ فلا تقعدوا معھم حتیٰ یخوضوا فی حدیث غیرہ انکم اذا مثلھم " (۱) جس وقت تم دیکھو یا سنو کہ خدا کی آیتوں کا انکار کیا جا رہا ہے اور اس کا مذاق اڑایا جا رہا ہے تو انکے ساتھ نہ بیٹھو، یہاں تک کہ وہ لوگ اس کے علاوہ دوسری باتوں میں مصروف نہ ہو جائیں ورنہ تم بھی انھیں میں سے ہوجاؤ گے یہ نہ کہو کہ ہم مومن ہیں اور خدا ورسول کو

....

(۱) سورہ نساء: آیہ ۱٤۰۔

مانتے ہیں لہذا ان کافروں کی باتیں ہمارے اندر اثر نہیں کریں گی۔جب تک تم ہر طرح سے محکم اور محفوظ نہ ہو جاؤ اس وقت تک اس بات کا خوف ہے کہ اگر تم ان کے جلسوں میں جاؤ گے،تقریروں کو سنو گے تو یہ فکری جراثیم دھیرے دھیرے تمھارے اندر بھی سرایت کر جائیں گے اور تمھارے اعتقاد و ایمان کو خراب کر دیں گے اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:" اذا رایت الذین یخوضوا فی آیاتنا فاعرض عنھم حتیٰ یخوضوا فی حدیث غیرہ" (۱) اور جب تم دیکھو

کہ لوگ ہماری نشانیوں کے بارے میں بے ربط بحث کررہے ہیں تو ان سے کنارہ کش ہوجاؤ یہاں تک کی وہ دوسری باتوں میں مصروف ہوجائیں۔خدا کا دستور جو کہ ہماری اور آپ کی روح کا معالج ہے اور جو دوا تجویز کرتا ہے وہ یہ ہے کہ پہلے لازمی علم ومعرفت کے ٹیکے کے ذریعہ محفوظ ہونے سے پہلے ایسی محافل وجلسات میں کہ جہاں فکری شبہات اور باطل خیالات پیدا کئے جاتے ہیں شرکت نہ کرو، وہ اخبار، مقالہ اور ڈائجسٹ نیز ایسی کتابیں جو کہ مذہبی مقدسات کا مسخرہ کرتے ہیں اور ان کی توہین کرتے ہیں اور دین کے اصول اور احکام میں شک وشبہ کا سبب واقع ہوتے ہیں تو ان کو نہیں پڑھنا چاہئے۔اگر ایسی جگھوں پر جائیں گے یا ایسی چیزوں کو پڑھیں گے تو کیا ہوگا؟ قرآن میں اس کے جواب کے متعلق ارشاد ہوتا ہے

:"انکم اذاً مثلھم انّ اللہ جامع الکافرین و المنافقین فی جھنم جمیعاً"(۲)

....

(۱) سورہ انعام: آیہ ٦٨۔

(۲) سورہ نساء: آیہ ١٤٠۔

اور اس صورت میں تم بھی انھیں کے مثل ہوجاؤ گے، بیشک خدا کافروں اور منافقوں سب کو جہنم میں جمع کرنے والا ہے۔" اگر تم نے ہماری نصیحت کو قبول نہیں کیا اور اپنے کانوں سے سن کر اس پر عمل نہیں کیا اور ایسے لوگوں کے ساتھ اٹھے بیٹھے تو تم بھی دھیرے دھیرے مقدسات کی اہانت کرنے اور دینی عقائد واحکام کو کمزور کرنے والوں میں شمار کئے جاؤ گے اور آخر کار تم

بھی جہنم میں جاؤ گے۔

جس طرح کوئی پھیلنے والی بیماری میں مبتلا ہو تو آپ اس سے بچتے اور دور رہتے ہیں تا کہ اس کی بیماری کی زد میں آپ بھی نہ آ جائیں اسی طرح آپ کو ان لوگوں کے جلسات اور خود ان لوگوں کے درمیان نہیں جانا چاہیئے جو فکری بیماریوں کو اٹھائے پھرتے ہیں یا نقل کرتے ہیں، لہذا ان سے پرہیز کرنا چاہیئے مگر یہ کہ آپ محفوظ رہنے والے اسباب و وسائل سے مجہّز ہوں، جو کہ پھیلنے والے جراثیم کو آپ کے اندر آنے سے روک سکیں، اس حالت میں صرف ان سے بچنا ہی نہیں چاہیئے بلکہ ان کے علاج کی کوشش کرنی چاہیئے، اور ان کو اس بیماری سے نجات دلانا چاہیئے جس طرح ڈاکٹر اور نرس، محافظ وسائل اور سسٹموں کے ذریعہ جراثیم اور اس کے اثرات کے داخل ہونے سے روکتے ہیں نیز جسمانی بیماریوں سے مریضوں کا علاج کرتے ہیں۔

اگر چہ ڈاکٹر کا فریضہ ہے کہ وہ بیمار کے قریب آئے اور اس سے ربط رکھے پھر بھی وہ یہ کام بہت احتیاط سے کرتا ہے اور تمام حفاظتی چیزوں کی رعایت کرتے ہوئے انجام دیتا ہے اور دوسرے لوگ علم و وسائل کے نہ ہونے کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ وہ بیماری سے متعلق کچھ نہیں کر سکتے بلکہ بیمار کے قریب ہونے کی وجہ سے وہ خود بھی بیمار ہو جاتے ہیں، انھیں کسی بھی صوورت سے ایسی حالت میں مریض سے قریب نہیں ہونا چاہیئے۔ ممکن ہے کہ لوگوں کی روح اور فکر بھی پھیلنے والی خطرناک بیماریاں رکھتی ہوں اور لازمی احتیاط نہ کرنے کی وجہ سے ان کی بیماریاں ہمارے اندر سرایت کر جائیں۔

روح کی بیماری اور سلامتی

روح کی مکمل سلامتی کی علامت اور نشانی یہ ہے کہ وہ خدا کو دوست رکھے، اس کے اندر خدا کی یاد، اس کے ذکر سے لذت اور خوشی کا احساس ہو نیز ہر وہ چیز اور ہر وہ شخص جو اس کی سچی اطاعت اور اس کے حکم کی پیروی کرتا ہو اس سے عشق اور والہانہ محبت کرتا ہو۔ روح کے بیمار ہونے کی نشانی یہ ہے کہ جب نماز، دعا اور دینی محافل و مجالس سے متعلق گفتگو ہو تو اس کے اندر کوئی جذبہ پیدا نہ ہو اور بہت ہی ناگواری اور بے توجہی کے ساتھ اس کے لئے آمادہ ہوتا ہو؛ اگر کوئی انسان کئی گھنٹوں سے کھانا نہ کھائے ہو اور اس کے بعد بھی اس کو بھوک نہ لگے اور بہترین اچھی غذاؤں کو کھانے کے لئے تیار نہ ہو تو یہ بیماری اور مزاج کے خراب ہونے کی نشانی ہے۔

ہم کو یہ جاننا چاہئے اور اس بات پر متوجہ ہونا چاہئے کہ دل بھی بیماریاں رکھتا ہے، خداوند عالم فرماتا ہے: "فی قلوبھم مرض" (۱) یعنی ان کے دلوں میں مرض ہے، اگر دل میں بیماری ہو اور اس کا علاج نہ ہو تو بیماری بڑھتی جاتی ہے، فزادھم اللہ مرضاً (۲) اور اللہ ان کی بیماری کو زیادہ کر دیتا ہے؛ اگر ہم اس بیماری کو بڑھنے سے نہ

....

(۱۔۲) سورہ بقرہ: آیہ ۱۰۔

روکیں اور وہ دل کے اندر جڑ پکڑ لے تو پھر کنٹرول سے باہر ہو جاتی ہے اور پھر اس کے اچھا

ہونے کی امید باقی نہیں رہتی؛ اس کی مثال ایسے ہی ہے کہ جیسے کوئی آدمی نہایت ڈھالو اور گہری کھائی میں جا پڑا ہو اور اپنے کو اس کی تہ تک گرنے سے نہ روک سکتا ہو۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے " طبع اللہ علیٰ قلوبھم و سمعھم و ابصارھم اولٰئک ھم الغافلون" (۱) خدا نے ان کے دلوں اور کانوں نیز ان کی آنکھوں پر مہر لگادی ہے وہی لوگ غافل اور لا پرواہ ہیں۔

کبھی اس حال میں کہ ہماری بیماری کینسر اور لا علاج بیماری میں تبدیل ہو جاتی ہے، ہم اس سے غافل رہتے ہیں اور کبھی کبھی تو بہت خوش رہتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ دن بہ دن ترقی حاصل کر رہے ہیں اور منزل کمال سے نزدیک ہو رہے ہیں خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے ": قل ھل ننبئکم بالاخسرین اعمالا الذین ضل سعیھم فی الحیٰوۃ الدّنیا وھم یحسبون انھم یحسنون صنعا" (۲) اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے کہ کیا ہم تم لوگوں کو ان لوگوں کے بارے میں اطلاع دیں جو اپنے اعمال میں بدترین خسارہ میں ہیں؛ یہ وہ لوگ ہیں جن کی کوشش زندگانی دنیا میں بہک گئی ہے اور یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ اچھے اعمال انجام دے رہے ہیں۔

....

(۱) سورہ نحل: آیہ ۱۰۸۔

(2) سورہ کہف: آیہ ۱۰۳ اور ۱۰۴۔

ہماری روح جذب و دفع کی محتاج ہے اور اس بات کا انتخاب کہ کون چیز دفع کریں؟ اور کون چیز جذب کریں؟ یہ ہمارے اوپر چھوڑ دیا گیا ہے۔ ہمارے لئے یہ ممکن ہے کہ ہم سگریٹ نوشوں اور گانجا، بھنگا ور چرس پینے والوں کے مانند دھوئیں اور زہریلی چیز کو اپنی روح میں

داخل کریں اور یہ بھی ممکن ہے کھلاڑیوں ،کوہ نوردوں (پہاڑ پر سفر کرنے والوں) کی طرح پاک اورصاف وشفاف ہوا کودل اورروح کے لئے انتخاب کریں؛من کان یرید العاجلۃ عجّلنا لہ فیھا ما نشاءلمن یرید۔۔۔۔۔(۱) جوشخص بھی دنیا کا طلبگار ہے ہم اسکے لئے جلد ہی جو چاہتے ہیں دیدیتے ہیں پھر اسکے بعد اسکے لئے جھنم ہے جسمیں وہ ذلت ورسوائی کے ساتھ داخل ہوگا اور جوشخص آخرت کا چاہنے والا ہے اور وہ اسکے لئے ویسی ہی کوشش بھی کرتا ہے اور صاحب ایمان بھی ہے تو اسکی سعی یقینا مقبول ہے ہم آپ کے پروردگار کی عطاوبخشش سے ان سب کی مدد کرتے ہیں اور پروردگار کی عطا کسی پر بند نہیں ہے۔ وہ لوگ جو کہ جلد ختم ہونے زندگی اوروالی لذتوں کے طلبگار ہیں اور اسکے علاوہ کوئی غوروفکر نہیں کرتے اور طبعی طور سے اس تک پہنچنے کے لئے کوشش کرتے ہیں لیکن پھر بھی تمام توقعات اور خواہشات تک نہیں پہنچ پاتے کیونکہ انسان کی خواہشیں بے انتہا ہیں جو کچھ اسکو عطا کیا جاتا ہے اسکے بعد بھی وہ اس سے زیادہ کی تلاش میں رہتا ہے، بہرحال خدا انکی اس طرح مدد کرتا ہے کہ انکی بعض خواہشوں کو پورا کرتا ہے لیکن انجام اورنتیجہ میں

....

(۱)سورہ اسراء آیہ ۱۸ الیٰ ۲۰۔

انکے لئے ذلت اور عذاب جھنم ہے بعض دوسرے گروہ ہیں جو کہ آخرت کے طلبگار اور اسکی نعمتوں کی لذت چاہتے ہیں؛ قرآن کی عبارت میں یہ گروہ توجہ کے لائق ہے ارشاد ہورہا ہے :سب سے پہلے ارادالآخرۃ آخرت کے چاہنے والے ہیں؛ لیکنا ایسی چاہت نہیں کہ اسکو

حاصل کرنے کیلئے کچھ خرچ نہیں کرتے؛بلکہوسعیٰ لھا سعیھا وہ اسکے لئے کوشش کرتے ہیں اور مناسب چیزوں کو اپنی اس خواہش پر صرف کرتے ہیں؛لیکن صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وھومومن یعنی ایمان کے مزہ کو بھی اپنی کوشش اور عمل کے ساتھ شامل کرتے ہیں،ایسے لوگ صرف اپنی خواہشوں کو ہی نہیں پہنچتے؛ بلکہ اسکے ساتھ ساتھ ہم (خدا) ایسے لوگوں کی محنت اور کوشش پر ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں کان سیعھم مشکوراًان کی کوششیں لائق شکر ہیں البتہ خداوند عالم کا شکر کیا ہے؟ وہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

جوبات اس آیت میں اہم اور توجہ کے قابل ہے وہ یہ ہے

: کلاًنمدھولاء من عطاء ربك

ہم دونوں گروہ کو ان کی خواہشوں تک پہونچنے میں مدد کرتے ہیں اور دونوں کے لئے وسائل و اسباب کو مہیّا کرتے ہیں یعنی ان چیزوں کا انتخاب جوجذب ودفع سے متعلق ہے خود انسان کے اوپر ہے انسان کا انتخاب اچھا ہو یا برا؛اس سے فرق نہیں پڑتا ہے،ہماری طرف سے اس کو اپنی خواہش تک پہونچنے میں مدد ملتی ہے؛اس ضمن میں ایک دوسری الٰھی سنت بھی پائی جاتی ہے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے

": من جاء با لحسنة فله عشر امثالها ومن جاء بالسّیئة فلا یجزیٰ الاّ مثلها"(۱)

جوکوئی اچھا کام کرتا ہے اس کو اس کا دس گنا ثواب ملتا ہے اور جوکوئی برا کام کرتا ہے اس کا بدلہ اس کو اتنا ہی ملتا ہے جو شخص غلط اور زہریلی چیزوں کا انتخاب کرتا ہے تو جتنی وہ چیز اور مادہ

خراب کرنے کی قوت اور طاقت رکھتا ہے اتنا ہی ہم اس کو موثر بناتے ہیں؛ لیکن جب وہ اچھی چیز اور اچھے مادہ کا انتخاب کرتا ہے تو ہم اس کی تاثیر کو دس گنا بڑھا دیتے ہیں۔

....

(۱) سورہ انعام آیہ ۱۶۰.

بحث کا خلاصہ

اس جلسہ میں ہماری بحث کا نتیجہ یہ نکلا کہ انسان جسمانی زندگی میں جس طرح جاذبہ اور دافعہ کی ضروت رکھتا ہے اسی طرح روحانی اور معنوی زندگی میں بھی جاذبہ اور دافعہ کی ضرورت رکھتا ہے یعنی اس کو ضرورت ایسی قوت وطاقت کی ہے جو اس کے ایمان، خدا کی محبت اور مفید علم کی راہ میں اس کی مدد کر سکے جو کہ اس کے دل اور قلب کے لئے فائدہ مند ہو، اس کی انسایت کو بڑھائے اور اس کو مضبوط کرے اور اس کو ایسی قوت و طاقت کی بھی ضرورت ہے جس کے ذریعہ وہ شیطان، گناہ اور دشمنان خدا کی محبت جو اس کے دین اور معنوی زندگی کے لئے نقصان دہ ہے کو اپنی روح سے دور کر دے۔

البتہ یہ بات فراموش نہیں ہونی چاہئے کہ ہماری اصل بحث جیسا کہ میں نے اس کو شروع میں بھی عرض کیا اسلام میں جاذبہ اور دافعہ سے متعلق تھی اور میں نے عرض بھی کیا کہ اس کو تین طرح سے پیش کیا جا سکتا ہے:

(۱) یہ کہ اسلام کے مجموعی عقائد و اخلاق، احکام اور دستورات ایسے ہیں کہ انسان کو صرف کچھ چیزوں کے جذب کرنے پر مجبور کرتے ہیں یا فقط دفع کرنے پر یا یہ دونوں قسمیں پائی جاتی

ہیں۔

(۲) اسلام کے احکام اور دستورات ایسے ہیں کہ انسان کے لئے صرف جاذبہ رکھتے ہیں یا صرف دافعہ یا پھر جاذبہ اور دافعہ دونوں رکھتے ہیں۔

(۳) اسلام لوگوں کو جب اپنی طرف اور ان کی تربیت کی دعوت دیتا ہے تو صرف جذبی راستوں کا انتخاب کرتا ہے یا فقط دفعی راستوں اور طریقوں کو، یا دونوں راستوں کو اختیار کرتا ہے۔ہم نے اس جلسے میں جو کچھ کہا اصل میں وہ اس بحث کا مقدمہ تھا اور تینوں سوالات ابھی بھی باقی ہیں جن کے بارے میں آئندہ جلسوں میں بحث اور گفتگو ہوگی۔

سوال اور جواب

سوال: جسم کے بارے میں یہ مسئلہ ہے کہ اس کے اندر معین مقدار میں غذا کو جذب کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے اگر اس سے زیادہ وہ کھانا کھائے گا تو اس کے لئے نقصان کا سبب بنے گا اور وہ دافعہ کی حالت کو پیدا کرے گا۔کیا روح اور اس کی غذا کے بارے میں بھی یہی محدودیت اور حد بندی ہے؟

جواب: سوال بہت اہم ہے اور یہ سوال فلسفہ اخلاق کے مشہور مکتب فکر سے جس کا نام "مکتب اعتدال" ہے تعلق رکھتا ہے اس مکتب فکر کے طرف دار لوگ اس بات کے معتقد ہیں کہ اخلاقی فضائل کے باب میں فضیلت کا معیار اعتدال ہے؛ زیادہ بڑھ جانا یا کم ہونا نقصان دہ ہے۔

فطری اور طبعی طور سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بعض چیزیں کوئی خاص حد نہیں رکھتی ہیں؛ جتنی زیادہ ہوں بہتر ہے جیسے خدا کی محبت ،عبادت ،علم اور بہت سی ایسی چیزیں ہیں ان جیسی چیزوں میں اعتدال کے کیا معنی ہیں؟؛ جو سوال یہاں پر پیش ہوا ہے وہ بھی اسی جیسا ہے جس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات صحیح ہے کہ فضائل کا حاصل کرنا کوئی حد اور انتہا نہیں رکھتا لیکن مسئلہ یہاں پر یہ ہے کہ انسان دنیا میں محدود طاقت کا مالک ہے۔ اگر وہ صرف کسی ایک چیز کے لئے اپنی پوری طاقت کو صرف کر دے گا تو دوسری چیزوں سے محروم ہو جائے گا؛ اگر ہم صرف عبادت کرنے لگیں اور کھانے، آرام اور اپنے بدن کی سلامتی کی فکر نہ کریں تو ہمارا جسم بیکار ہو جائے گا اور عبادت کی طاقت و ہمت بھی ہم سے چھن جائے گی؛ یعنی ہماری عبادت میں بھی خلل پڑے گا اور ہمارا جسم بھی بیمار پڑ جائے گا۔ یا یہ کہ خدا کا ارادہ انسان کی نسل کو باقی رکھنا ہے اور یہ مسئلہ بھی اس بات پر منحصر اور متوقف ہے کہ ہم شادی بیاہ کریں، ازدواجی رابطہ کو برقرار رکھیں؛ بچوں کی تربیت کریں خلاصہ یہ کہ ایک خاندان کو چلانے اور اس کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے یقینی طور پر بہت سی قوتوں اور اپنے وقت کو خرچ کرنا پڑے گا؛ اگر انسان صرف معنوی اور اخلاقی مرتبے کی بلندی کی فکر میں رہے گا اور کوئی بھی اہتمام خاندان اور بیوی بچے سے متعلق نہ کرے تو انسانی نسل ختم ہو جائے گی یا برباد ہو جائے گی۔ یا مثلاً اگر کوئی یہ چاہتا ہے کہ میدان جنگ میں حاضر رہے تو وہ زیادہ عبادات اور مستحبات کو انجام نہیں دے سکتا۔ لہٰذا چونکہ انسان دنیا میں کئی قسم کے وظائف اور ذمہ داریوں کو رکھتا ہے اس کی قوت و طاقت بھی محدود ہے؛ لہٰذا اپنی طاقت و قوت کو ان کے درمیان تقسیم کرے

اور ہر حصّہ میں ضرورت بھراس طرح صرف کرے کہ بعض دوسری چیزوں سے مزاحمت کا سبب نہ بنیں ان کے لئے خرچ کرے؛ البتہ یہ انسان کے لئے ممکن ہے کہ وہ ایسا کام کرے کہ اس کی پوری زندگی نماز وقرآن سے لیکر کھانے پینے اورروزانہ کے معمولی کاموں تک بھی لمحہ بہ لمحہ خداوند عالم سے قریب ہونے کا باعث بنے اور وہ بلندی کے درجات کو حاصل کرتا جائے۔

اسلام میں جاذبہ اور دافعہ کے حدود (۳) پچھلی بحثوں پر سرسری نظر

پچھلے دوجلسوں میں اسلام میں جاذبہ اور دافعہ سے متعلق اوراس کے حدود کے بارے میں مطالب کوپیش کیا گیا اگر چہ وہ مطالب اصل بحث کے لئے مقدمہ کا جنبہ رکھتے تھے وہ اہم نکتہ جس کے متعلق پچھلے جلسے میں خاص تاکید ہوئی وہ یہ تھی کہ انسان تکامل حاصل کرنے والی ایک مخلوق کے عنوان سے تکامل کے راستے کی تکمیل میں دوطرح کے عوامل کا سامنا کرتا ہے:

(۱)ایک وہ عوامل واسباب جو کہ فائدہ مند ہیں

(۲) دوسرے وہ عوامل جو کہ نقصان دہ ہیں؛ انسان کو چاہئے کہ دوسرے زندہ موجودات کی طرح مفید عوامل کو جذب کرے اور مضر عوامل کو دفع کرے؛ اس کام کے لئے سب سے پہلا قدم اور مرحلہ یہ ہے کہ انسان ان دونوں طرح کے عوامل کو پہچانے اور ایک دوسرے کو علیحدہ اور جدا کرے؛ لہٰذا پہلا قدم ان عوامل کی پہچان ہے چونکہ یہ جذب ودفع جبری اور زبردستی

نہیں ہے بلکہ خود انسان کے ارادہ و اختیار سے متعلق ہے اور جس کو وہ انتخاب کرتا ہے وہی انجام پاتا ہے لہذا دوسری منزل یہ ہے کہ انسان اپنے ارادہ کو مضبوط کرے تاکہ اچھے کاموں کو انجام دے سکے اور برے کاموں کو ترک کر سکے کیونکہ ایسا نہیں ہے کہ ہر وہ چیز جو اچھی اور مفید ہے انسان اس سے لگاؤ رکھتا ہو اور اس سے لذت حاصل کرتا ہو یا ہر وہ چیز جو کہ اس کے لئے بری اور نقصان دہ ہے اسے ناپسند کرتا ہو اور اس میں رغبت نہ رکھتا ہو؛ بلکہ بہت سی جگہوں میں مسئلہ اس کے برخلاف ہے مثلاً وہ سبب جو کہ بہت نقصان دہ ہے اسی چیز کو انسان خاص طور سے بہت ہی لگاؤ کے ساتھ اختیار کرتا ہے مثلاً بعض لوگ سگریٹ اور شراب وغیرہ کو بہت دوست رکھتے ہیں، پیش کی جا سکتی ہے لہذا جذب و دفع کے مسئلہ میں شناخت اور پہچان کے علاوہ انسان کے ارادہ کی طاقت بھی بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔

انسان کی روح کے کمال کے لئے مفید اور مضر اسباب کی تشخیص کا مرجع

لیکن مفید اور مضر اسباب کے پہچاننے کے متعلق سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کون سا مرجع اس بات کو مشخص و معیّن کرے اور کہے کہ فلاں سبب ہمارے معنوی کمال اور روح کے لئے فائدہ مند ہے اور اس کو جذب کرنا چاہئے اور کون سا عامل نقصان دہ ہے کہ اس کو دفع کرنا چاہئے؟

اسی طرح ارادہ کی تقویت کے متعلق، کون سے عوامل ہیں جو اس ارادہ کو قوی بناتے ہیں؟

ہم مسلمان اور دیندار لوگ اعتقاد رکھتے ہیں کہ وہ مرجع خدا ہے اور اسی کو اس مشکل کو حل کرنا

چاہئے کیوں کہ اسی نے انسان کو پیدا کیا اور وہی مکمل طور سے انسان کی روح وجسم کے خواص وقوانین نیز ان کے ایک دوسرے پر اثرات سے واقف ہے ※ اور وہی خدا یہ جانتا ہے کہ کون سی چیز انسان کے لئے مفید ہے اور کون سی چیز مضر ہے اور کون سے کام روحی ومعنوی جذب اور دفع کا باعث ہے؛ خداوند عالم نے اس کام کو پیغمبروں کے ذریعہ سے انجام دیا ہے انبیاء کے بھیجنے کا بنیادی فلسفہ یہی تھا دین اور اس کے تمام دستورات اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہیں یعنی اگر انسان یہ چاہتا ہے کہ وہ روحی ومعنوی کمال اور بلندی پر پہونچے اور مفید ومضر اسباب جو کہ اس راستے میں ہیں، ان کو پہچانے تو اس کو دین وانبیاء کو تلاش کرنا چاہئے یعنی انبیاء اور دین سے متمسک ہونا چاہئے۔

دین کی تبلیغ کے سلسلہ میں اسلام کی کلی سیاست

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم کو کیا کرنا چاہئے تا کہ لوگ دین کی طرف متوجہ ہوں؟ صرف یہ کہ انبیاء نے روحی اور معنوی تکامل کا نسخہ انسان کے ہاتھوں میں تھما دیا ہے اور ان لوگوں کو صحیح راستے کی نشان دہی کر دی ہے، یہی کافی ہے؟ بلکہ اس کے علاوہ ایسی تدبیر کرنی ہوگی کہ لوگ اس نسخہ کو قبول کر لیں اور اس پر عمل کریں؛ اب اس جگہ پر پھر جاذبہ اور دافعہ کی بحث آتی ہے ؛لیکن جاذبہ اور دافعہ اس معنی میں کہ انبیاء نے لوگوں کو دین کی طرف بلانے اور ان لوگوں کو اس کے قبول کرنے اور اس پر مطمئن کرنے کے لئے کس راستے اور طریقے کو اختیار کیا ہے؟ یعنی اس کے لئے آیا قوت جاذبہ کے طریقے کو اپنایا اور نرمی ومہربانی کے ساتھ اس بات

کی کوشش کی کہ لوگ دین کی طرف جذب ہوں یا یہ کہ ان حضرات نے سختی اور جبری طور سے لوگوں سے چاہا کہ لوگ اس نسخہ پر عمل کریں؟ یا یہ کہ ان دونوں طریقوں کو استعمال کیا؟ خلاصہ یہ کہ کوئی خاص قانون اور قاعدہ اس کے متعلق پایا جاتا ہے یا نہیں؟ ان تین سوالوں میں ایک سوال ہے جس کے لئے ہم نے پچھلے جلسے میں وعدہ کیا تھا کہ اس کے بارے میں بحث کریں گے البتہ اگر اس مسئلہ میں تفصیل اور جامع ومکمل طریقے سے بحث کی جائے تو کئی جلسوں کی ضرورت ہوگی جس کی گنجائش فی الحال ہمارے جلسے اور پروگرام میں نہیں ہے، لہذٰا کوشش اس بات کی ہوگی کہ جو کچھ اس سے مربوط ہے اس کو مختصر طور سے یہاں بیان کر دیا جائے۔

(الف) موعظہ اور دلیل سے استفادہ

انبیاء کا سب سے پہلا کام لوگوں کو حق کی طرف دعوت دینا ہے؛ ان کو سب پہلا کام یہ کرنا تھا کہ لوگ ان کی باتوں کو سنیں اور اس بات کو محسوس کریں کہ انبیاء کیا کہتے ہیں اس کے بعد کا مرحلہ یہ تھا کہ لوگ اس پر عمل کرتے ہیں یا نہیں؟

اس پہلے مرحلے یعنی دعوت تبلیغ اور پیغام پہونچانے میں کچھ بھی شک وشبہ نہیں ہے کیونکہ انبیاء لوگوں کے لئے منطق اور برہان واستدلال لیکر آئے تھے اور قرآن مجید کی آیہ اس پر دلالت کرتی ہے" ادع الیٰ سبیل ربّک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ" (۱) یعنی لوگوں کو پروردگار کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ دعوت دو؛ دعوت تبلیغ، حکمت اور منطق و دلیل کے ساتھ ہونی چاہئے تاکہ اس میں جاذبہ پیدا ہو؛ اس مرحلہ میں دافعہ کا کوئی سوال ہی

نہیں پیدا ہوتا ہے۔

لیکن واقعیت اور حقیقت یہ ہے کہ تمام انسان ایک جیسے نہیں ہیں کہ حکمت ودلیل اچھی طرح سمجھ لیں؛ اگر ہم خود اپنے کو دیکھیں جس دن سے ہم نے اپنے کو پہچانا

....

(۱) سورہ نحل: آیہ ۱۲۵۔

ہے ہم نے سنا ہے کہ ایک دین اسلام اور ایک مذہب شیعہ نام کا پایا جاتا ہے اور ہم نے اس کو قبول کیا ہے؛ لیکن کیا ہم نے حقیقت میں کبھی اس بات پر غور کیا اور سوچا کہ اس کی عقلی دلیل کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ بہت سے لوگوں نے اجتماعی اسباب اور عوامل سے متاثر ہو کر شیعہ مذہب کو قبول کیا ہے؛ اور اصلاً ان لوگوں نے اس سلسلہ میں کوئی تحقیق اور جستجو نہیں کی ہے اور نہ اس کی کوئی دلیل تلاش کی ہے؛ ہاں مجلس، اسکول اور مدرسے میں کبھی اس سلسلے میں کچھ پڑھا اور سنا ہے لیکن خود سے اپنے اندر ابتدائی طور پر یہ جذبہ اور خواہش نہیں ہوئی کہ اس بارے میں جا کر تحقیق اور جستجو کریں، اگر ہے بھی تو بہت کم لوگوں میں۔ اکثر لوگ جذبات اور احساسات سے متاثر ہو کر یا مادی اور معنوی جذبوں کے تحت حرکت کرتے ہیں منطق اور دلیل کے ساتھ بہت کم لوگ متوجہ ہوتے ہیں؛ عام انسانوں کے اندر جو چیز اصلی محرّک ہے وہ فائدہ یا نقصان اور خوف یا امید ہے وہی چیز جو کہ اسلامی تہذیب میں خوف ورجا کے نام سے پائی جاتی ہے یعنی انسان کسی چیز سے خوف رکھتا ہے یا اس چیز میں اس کا کوئی فائدہ ہوتا ہے تو وہ اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے یا یہ کہ اس چیز میں دولت، بلندی اور شہرت تو اس کی طرف قدم

بڑھاتا ہے یا پھر یہ کہ بھوک، بیکاری، تازیانہ، قیدخانہ اورسزا کے خوف کی وجہ سے مجبور ہوکر اس کام کو کرتا ہے، یہ مثل بہت مشہور ہے کہ انسان خوف وامید کی وجہ سے زندہ ہے؛ عام طور سے یہ خیال پایا جاتا ہے کہ اگر سبق اور درس پڑھے گا تو اس کی وجہ سے دوستوں اور ساتھیوں سے پیچھے نہیں رہ جائے گا یا تعلیم اس لئے حاصل کرتا ہے کہ اس کے بعد کوئی مفید کام کرے گا اور پیسہ وغیرہ کما سکے گا یا اس لئے کہ سبق پڑھ کر ماں باپ کی ڈانٹ پھٹکار اور دوسروں کے طعنہ سے محفوظ رہے گا کیونکہ اکثر لوگ ایسے ہی ہیں، لہٰذا جیسا کہ آیہ کریمہ میں ہے کہ پہلے حکمت کا لفظ ہے اور اس کے بعد موعظہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے" ادع الیٰ سبیل ربّک با لحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ" یعنی برہان ودلیل کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر اس کام کو انجام دو گے اور کروگے تو اس سے یہ فائدہ حاصل ہوگا اور اگر اس کام کو نہیں کروگے تو یہ نقصان ہوگا یا اس کے برعکس اگر اس کام کو کروگے تو یہ نقصان ہوگا اور اس کو چھوڑ دوگے تو تم کو یہ فائدہ ہوگا۔

اگر قرآن کریم میں انبیاء کے اوصاف کا ہم غور سے مطالعہ کریں تو ان کی صفتوں میں بہت سی جگہوں پر مبشر اور منذر کا لفظ آیا ہے کہ انبیاء بشارت اور انذار کے لئے آئے ہیں، خداوند عالم قرآن کریم میں فرماتا ہے" ومانرسل المرسلین الاّ مبشرین ومنذرین" (۱) ہم نے پیامبروں کو صرف مبشر اور منذر بنا کر بھیجا ہے یعنی وہ صرف بشارت دینے والے اور ڈرانے والے ہیں۔

انبیاء نے دعوت اور تبلیغ کے مرحلے میں صرف برہان ودلیل (حکمت) پر اکتفا نہیں کیا بلکہ وہ ،جس کو میں نے پہلے بیان کیا اور شروع میں مختصر طور سے اس کی

....

(۱) سورہ انعام آیہ ٤٨ .

وضاحت کے ساتھ ساتھ وہ لوگوں سے یہ بھی کہتے تھے کہ اگر ہماری باتوں کو تم لوگ قبول کرو گے اوران پر عمل کرو گے تو اس کے بدلے تمھارے حصّہ بے پناہ نعمتیں اور ہمیشہ رہنے والی بہشت آئے گی اور اگر تم نے ہماری باتوں کو قبول نہیں کیا اور مخالفت کی تو جہنم اور اس کا عذاب تمھارا منتظر رہے گا؛ اب اس جگہ پر لوگ مواقفت یا مخالفت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اس کی تاثیر اس وقت زیادہ مضبوط ہوجاتی ہے جب اس کے عملی نمونے یا وہ واقعے جو کہ پہلے زمانے میں ہوچکے ہیں ان کے کانوں تک پہونچتے ہیں؛ اسی لئے آپ قرآن مجید میں دیکھیں گے کہ پچھلی امتوں کے واقعات اور جو عذاب ان پر نازل ہوئے ہیں ان کا تذکرہ ہے اور اس بات سے متنبہ کیا گیا ہے کہ ہرگز تم بھی ایسا کام نہ کرنا ورنہ تمھارا حشر بھی ویسا ہی ہوگا؛ اس جگہ انسان کے ضمیر کے اندر ایک بےچینی اور اضطرابی کیفیت اور تحریک پیدا ہوتی ہے؛ البتہ نفع اور فائدہ کی امید اور نقصان کے خوف، ان دونوں میں نقصان کا خوف انسان کو کام پر زیادہ ابھارتا ہے؛ یعنی اگر کچھ حد تک دنیاوی اور مادی نعمتوں کو حاصل کر لیتے ہیں اور پھر اس سے کہا جائے اگر ایسی کوشش اور زحمت کرو گے تو دولت و نعمت اور شہرت اس سے زیادہ حاصل ہو گی؛ ممکن ہے کہ اگر وہ جذبہ و حوصلہ نہ رکھتا ہو تو یہی کہے گا کہ جو کچھ میرے پاس ہے وہی کافی ہے؛ لیکن اگر اس سے کہا جائے کہ اگر کوشش نہیں کرو گے تو تمھاری دولت اور ثروت کم ہو جائے گی اور رتبہ کم ہو جائے گا؛ چونکہ نقصان کا خوف ہے تو وہ کوشش کرتا ہے کہ نقصان نہ ہونے پائے، اور شاید اسی لئے قران کریم میں بشارت اور انذار ساتھ ساتھ ذکر ہوئے ہیں

لیکن پھر بھی انذار سے متعلق زیادہ تاکید ہے، خداوندتبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہوتا ہے:" وان من امۃٍ الاّ خلا فیھا نذیر" (۱) یعنی کوئی امت ایسی نہیں گذری ہے جس میں نذیر (ڈرانے والے) نہ ہوں اسی وجہ سے دعوت وتبلیغ کے آغاز میں جاذبہ اوردافعہ دونوں ایک ساتھ ہونے چاہئیں کیونکہ اس میں حکمت اوراستدلال بھی ہے اورجنت کا وعدہ اورجہنم سے ڈرانا بھی ہے وجہنم کے سلسلے میں جوروایات ہیں ان میں دلچسپ اورنہایت ہی وحشتناک طریقے سے ڈرانے والے کے وصف کو بیان کیا گیا ہے۔

....

(۱)سورہ فاطر: آیہ ۲٤۔

(ب)موعظہ حسنہ [نیک اور درست] ہونا چاہئے

جونکتہ یہاں پایا جاتا ہے وہ یہ کہ جب حکمت کے بعد موعظہ کا موقع آئے تو موعظہ حسنہ ہونا چاہئے یعنی اگر چہ موعظہ بشارت اور انذار دونوں پر مشتمل ہوتا ہے اور اس کے معانی و مطالب اچھے نہیں لگتے لیکن اسکے بیان کی کیفیت اورانداز اچھا اوردلپذیر ہونا چاہئے یہاں تک کہ اگرانذار کا مخاطب فرعون جیسا گمراہ انسان بھی کیوں نہ ہو؟ بھی خداوند عالم موسیٰ اور ان کے بھائی ہارون سے کہتا ہے: اذھبا الیٰ فرعون انہ طغیٰ وقولا لہ قولا لینا۔۔(۱) فرعون کی طرف جاؤ اس نے سرکشی کی ہے اس سے نرم لہجہ میں گفتگو کرو، شاید کہ وہ قبول کرے یا خوف اختیار کرلے، یعنی فرعون سرکش ہے پھر بھی تمہارے الفاظ اورڈرانے کا طریقہ ایسا ہو کہ وہ ڈر جائے؛ لیکن ڈرائیں تو اپنے الفاظ کو نرمی اور ملائمت کے ساتھ بیان کرو پہلے سختی اورخشونت

کے ساتھ اسکے سامنے نہ جاؤ۔ دعوت اور تبلیغ کے وقت اگر شروع ہی میں چیخ اور تند کلامی سے اسکو متوجہ کروگے تو وہ اصلاً توجہ نہیں کرے گا کہ تم کیا کہہ رہے ہو لیکن اگر اس دافعہ والے الفاظ اور اسکے مطلب کو نرمی اور خوش اخلاقی کے ساتھ کہو گے تو ممکن ہے تمھاری بات اس پر اثر کرے۔

....

(۱) سورہ طہٰ: آیہ ۴۲ الیٰ ۴۴۔

(ج) مناظرہ

اس آیہ شریف میں موعظہ کے بعد مجادلہ کو بیان کیا گیا ہے" ادع الیٰ سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن" (۱) یعنی اچھی نصیحت کے ذریعہ لوگوں کو اپنے پروردگار کی طرف بلاؤ اور ان سے بہترین طریقہ سے مجادلہ کرو اس لئے کہ ان کی ہدایت کی طرف راہنمائی کرو تو اچھی طرح سے بحث و مناظرہ کرو، مناظرہ کے موقع پر اگر سامنے والا مغلوب بھی ہو جائے اور اسے علمی حیثیت سے شکست دیدو لیکن پھر بھی انصاف و عدالت اور ادب سے باہر نہ نکلو اسکو شکست دینے کے لئے مغالطہ کا سہارا نہ لو اس بات کی کوشش کرو کہ اسکو قانع اور مطمئن کر دو تا کہ حقیقت اسکو معلوم ہو جائے؛ ساری کوشش اس بات میں صرف نہ کرو کہ چاہے جیسے بھی ممکن ہو ہر قیمت پر اسکو میدان مناظرہ سے خارج کر دو۔

....

(۱) سورہ نحل: آیہ ۱۲۵۔

دعوت و تبلیغ میں دافعہ کے استفادہ نہ کرنے کی وجہ

لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ دعوت و تبلیغ کے ہر مرحلہ حکمت ،موعظہ ،مجادلہ میں سے کسی میں بھی خشونت و دشمنی اور دافعہ مناسب نہیں ہے اگر چہ مجموعہ کلام و گفتگو مین ممکن ہے کہ بات جہنم ، اسکی آگ اور عذاب سے متعلق ہو،لیکن گفتگو کا انداز ایسا دلپذ یر اور شیرین ہو کہ سامنے والا اس کو سننے اور اس پر غور و فکر کرنے پر آمادہ ہو جائے جب آپ اس انداز سے بات کریں گے کہ آپ کی بات سننے پر آمادہ ہو جائے تو وہ اس کے متعلق فکر کرے گا اور خود سے یہ کہے گا کہ اگر یہ جہنم اور عذاب واقعاً صحیح ہیں تو میں ہمیشہ کے لئے اس عذاب میں گرفتار ہو جاؤں گا پس بہتر یہ ہے کہ تحقیق اور جستجو کی جائے اور حقیقت ماجرا سے آگاہی حاصل کی جائے، خاص طور سے جب اس طرف متوجہ ہو کہ نفع اور نقصان کی تعیین میں صرف احتمال کی مقدار کافی نہیں ہے احتمال کا نتیجہ، محتمل (جس چیز کا احتمال ہو) میں ہے کیونکہ محتمل ہی آخری نتیجہ کو مشخّص و معیّن کرتا ہے یعنی ممکن ہے کہ احتمال کے مواقع اور موارد میں اگر چہ نفع یا نقصان کا احتمال بہت کم ہو لیکن اگر محتمل قوی ہے تو وہ ہمارے لئے حرکت کا سبب ہوگا مثلاً اگر پانچ سال کا بچہ آپ سے کہے کہ اس سیڑھی پر جس سے آپ اوپر جا رہے ہیں ایک بجلی کا تار ٹوٹ گیا ہے احتیاط سے کام لیجئے گا آپکا پیر اس پر نہ پڑے، یہاں پر مسئلہ، احتمال کے اعتبار سے بہت کمزور ہے کیونکہ پانچ سال کا بچہ کیسے بجلی کے تار کو پہچان سکتا ہے؟ ہوسکتا ہے ٹیلی فون کا تار یا رسّی تا اور کوئی دوسری چیز ہو، اسے کہاں سے معلوم کہ تار میں بجلی ہے؟ شاید کوئی ایک تار ہے جو ایسے

ہی سڑھیوں پر پڑا ہو، خلاصہ یہ کہ یہ پانچ سال کے بچے کی بات کوئی خاص احتمال آپ کی نظر میں پیدا نہیں کرتی لیکن پھر بھی یہ مسئلہ موت اور زندگی سے متعلق ہے بجلی سے کوئی مذاق نہیں کرسکتا، لہذا اگر چہ احتمال بہت ضعیف اور کم ہے لیکن محتمل بہت قوی ہے، آپ سیڑھی سے اوپر جانے میں بہت محتاط اور ہوشیار رہیں گے، اگر تار مل جائے تو بہت ہی احتیاط کے ساتھ اس سے بچ کر وہاں سے گذریں گے۔

ہماری بحث میں بھی محتمل بہت مضبوط اور قوی ہے یہ مسئلہ موت اور زندگی سے بھی بڑھ کر ہے، مسئلہ عذاب اور جہنم میں ہمیشہ رہنے کا ہے وہ عذاب اور جہنم جس کو اس طرح بیان کیا گیا ہے اگر اسی آگ اور جہنم کو نرم و آسان زبان، دردمند احساس اور مخلصانہ انداز کے ساتھ بیان کیا جائے تو اس بات کا احتمال زیادہ ہے کہ میری بات کو سنیں گے بلکہ اس سے متاثر بھی ہوں گے۔

انسان کے شخصی اور خصوصی افعال کے سلسلے میں اسلام کا طرز عمل

لیکن اگر دعوت وتبلیغ کے مرحلہ سے آگے بڑھ کر قوم، معاشرہ اور عوام کے عمل نیز معاشرہ پر اس کے اثر کے متعلق بحث ہو تو بات جدا ہوگی اور مسئلہ یہاں پر فرق کرتا ہے، کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک پوشیدہ کام ہے اور اس کا فائدہ یا نقصان پوری طرح سے ایک خاص شخص سے مربوط ہے اور اس کا اثر سماج اور معاشرہ پر کچھ بھی نہیں ہے مثلاً ایک انسان نماز شب پڑھنے

کے لئے آدھی رات کو بستر سے اٹھتا ہے اور بغیر کسی کو اطلاع دیئے ہوئے نماز میں مشغول ہو جاتا ہے، یا العیاذ باللہ ایک بوتل شراب نکال کر گھر کے کسی گوشہ میں چھپ کر پینا شروع کر دیتا ہے، ان جیسے موارد میں جاذبہ سے استفادہ کرنا بہت اچھا ہے یعنی اس کے لئے نماز شب کے فوائد کو بیان کیا جائے تا کہ اس کے اندر حوصلہ اور جذبہ پیدا ہو اور وہ نماز شب پڑھے، یا مخلصانہ اور دوستانہ طریقے نیز اچھے اور نرم لہجے میں شراب کے نقصانات کو اس کے سامنے پیش کیا جائے تا کہ وہ اس برے کام سے باز آجائے، لیکن اسلام میں ایسے مسائل (جو کہ پوری طرح ایک خاص فرد سے مربوط ہوں) میں طاقت وقوت اور سختی وعناد کے ساتھ منع کرنے کی اجازت نہیں دی گئی ہے، یہاں تک کہ اگر آپ کسی شخص کے ایسے کام سے مطلع ہوتے ہیں تو آپ کو یہ حق نہیں ہے کہ اس بات کو اس کے سامنے بیان کریں اور کہیں کہ ہاں میں نے تم کو یہ برا کام کرتے ہوئے دیکھا ہے، پھر کیسے صحیح ہے کہ آپ اس کے غلط کام کو دوسرے کے سامنے بیان کریں؟ یہ مومن کا راز ہے اس کو چھپانا چاہئے اور کوئی بھی اس کو ظاہر کرنے کا حق نہیں رکھتا ہے۔ اگر خدانخواستہ کوئی انسان تنہائی میں گناہ کرنے میں مصروف تھا اور آپ نے اس کو دیکھ لیا اگر آپ چاہتے ہیں کہ اس سے یہ کہیں کہ میں نے تم کو یہ برا کام کرتے ہوئے دیکھ لیا ہے تو ممکن ہے آپ کا یہی کہنا اس بات کا سبب ہو کہ وہ فکر کرے اب تو میرا گناہ عام ہو ہی چکا ہے چھپا کر کروں یا ظاہری طور، پر اب کوئی فرق نہیں پڑتا ہے، اس کے بعد کھل کر گناہ کروں گا کیونکہ گناہ تو ظاہر ہو چکا ہے لہٰذا ایسے گناہ کو ظاہر کرنا اسلام کی نظر میں جائز نہیں ہے؛ پھر کیا حق بنتا ہے کہ جبری اور قہری طور پر اس کے ساتھ ایسا سلوک کیا

جائے؟ہاں اگرایک ایسے بالواسطہ طور پر کہ وہ یہ نہ سمجھ پائے کہ آپ اس کے برے کام سے واقف ہو گئے ہیں تو ایسی جگہ پر ممکن ہے اس کو نصیحت کی جائے،تا کہ وہ اس برے کام سے باز آجائے،تو پھرایسا کرنا صحیح ہے۔

اجتماعی افعال کے ساتھ اسلام کا برتائو

بہت سے اعمال ایسے پائے جاتے ہیں کہ اس کا نفع یا نقصان ایک شخص سے کر پورے معاشرہ پر پڑتا ہے البتہ یہ تاثیر کبھی بلا واسطہ (ڈائریکٹ) ہوتی ہے اور کبھی بالواسطہ ہوتی ہے، بلا واسطہ تاثیر اس طرح کہ مثلاً کسی کو مارا پیٹا جارہا ہو یا اس پر ظلم ہورہا ہو؛ معاشرہ پر لوگوں کے عمل کی بالواسطہ تاثیر کے مصداق اوراس کے دائرہ کے متعلق اختلاف رائے کا ہونا ممکن ہے لیکن جو چیز مسلّم ہے اوراس میں کوئی بھی شک نہیں ہے وہ یہ کہ اگر چہ اس عمل کا اثر ظاہراً بعض جگہوں پر معاشرہ کے تمام افراد پر نہ پڑتا ہو لیکن غوروفکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا نہیں ہے مثلاً برے کام کو اگر کوئی لوگوں کے سامنے انجام دے،تو یہ ایک بالواسطہ طور پر سکھانے کا طریقہ ہے اور یہ اس بات کا سبب بنتا ہے کہ دھیرے دھیرے اس کا برا ہونا ختم ہو جاتا ہے، اگر ماں اور باپ بچوں کے سامنے جھوٹ بولیں تو گویا یہ بالواسطہ طور پر ان کو سکھاتے ہیں کہ جھوٹ بولنا کوئی قباحت نہیں رکھتا ہے اسی بالواسطہ تاثیر کی وجہ سے (جو کہ معاشرہ پر پڑتی ہے) اسلام نے تجاہر بہ فسق یعنی علی الاعلان گناہ کرنے کو منع کیا ہے اور بعض افعال کے متعلق یہ کہا ہے کہ اسکو علانیہ لوگوں کے سامنے انجام نہیں دے سکتے؛ یعنی اگر ایسے

اعمال کوکسی نے تنہائی مین چھپ کر انجام دیا ہے تو صرف گناہ کیا ہے؛ لیکن حقوقی طور پر اس نے کوئی جرم نہیں کیا ہے اور حکومت اسلامی بھی اسکو کچھ کہنے والی نہیں ہے؛ لیکن اگر اسی عمل کو وہ لوگوں کے سامنے کھل کر انجام دیتا ہے تو وہ مجرم شمار کیا جائیگا اور اسکو سزا ہوگی۔

بہر حال وہ اعمال جو کہ اجتماعی تاثیر رکھتے ہیں اور انکے انجام دینے سے لوگوں کے حقوق پر تجاوز ہوتا ہے انکی نسبت اگر انکی تاثیر بلا واسطہ ہوتی ہے تو اس صورت میں دنیا کے تمام عقلاء کہتے ہیں کہ ایک اجتماعی قوت یعنی حکومت تا کہ ان غلط کاموں کو جن کو دوسرے کے حقوق پر تجاوز کہا جاتا ہے، روک سکے، یہ مطلب اسلام اور دین الہی سے مخصوص نہیں ہے۔ ان موارد کے علاوہ اگر کسی جگہ کوئی عمل سماج کے لئے معنوی ضرر کا باعث ہو تو اسلام نے حکومت کو اجازت دی ہے بلکہ اس کو مکلف کیا ہے کہ اس میں دخل دے اور اس کام کو روکے؛ اور اسلام کا یہ کام ایک بنیادی اور جداگانہ حیثیت رکھتا ہے برخلاف دوسرے نظاموں جو کہ ڈموکراسی اور لیبرل نظام پر قائم ہیں جمہوری اور لیبرل نظام حکومت میں مثلاً اگر کوئی نیم عریاں یا نا مناسب لباس پہن کر سڑک پر آتا ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ اس انسان کی خاص رفتار ہے اور اس کا ذاتی معاملہ ہے اور اس کو کوئی کچھ کہہ نہیں سکتا، اس میں وہ پوری طرح سے آزاد ہے ؛لیکن اسلام نے اس عمل سے منع کیا ہے اس نے کہا کہ یہ عمل معنوی و تربیتی اعتبار سے تباہ کن اثرات کا حامل ہے، اگر کوئی شخص ایسے عمل انجام دیتا ہے تو اسلام نے اس کو خطا کار کہا ہے اور اس کے ساتھ مجرم کے عنوان سے سلوک کرنے کا حکم دیا ہے۔

جزائی اور کیفری قوانین، اجتماعی نظم قائم کرنے کا سبب

وہ اعمال جو کہ اجتماعی خرابیاں رکھتے ہیں اور دوسروں کے حقوق کی پامالی کا سبب بنتے ہیں ان کو ہر حالت میں روکا جانا چاہیئے اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور ظاہر سی بات یہ ہے کہ حکومت ان کاموں کو انجام دینے کے لئے قانون بنانے کی محتاج ہے وہ قوانین جو کہ ایک معاشرہ اور سماج میں ہوتے ہیں، ان کی دو قسم ہے: (۱) مدنی قانون (۲) جزائی قانون مدنی قانون (مدنی حقوق) لوگوں کے حقوق اور ان کی آزادیوں کو بیان کرتا ہے جیسے تجارت، شادی بیاہ، طلاق، میراث اور ان جیسے قانون۔

جزائی قانون (کیفری قانون) اس حکم کو بیان کرتا ہے جو مدنی قانون کی خلاف ورزی سے پیدا ہوتا ہے یعنی جب مدنی قانون نے لوگوں کی آزادی اور حقوق کو بیان کر دیا؛ اگر کوئی شخص اس قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے تو جزائی قانون اس کی سزا کو بیان کرتا ہے اور تمام حکومتوں کا ایک اہم قانون یہی جزائی قانون ہے؛ حکومت اس قانون کو بناتی ہے اور اس کو لاگو بھی کرتی ہے؛ اس کی اصل وجہ اجتماعی نظم کو برقرار رکھنا اور اس کو جاری رکھنا ہے اور وہ سب اسی جزائی قانون سے مربوط ہے؛ اگر حکومت صرف مدنی قانون کے بنانے پر اکتفا کرے اور صرف لوگوں کے حقوق کو بیان کرے اور جب لوگ اس قانون کی خلاف ورزی کریں، ان کے لئے کوئی قانون نہ ہو تو ہم بہت سے مواقع اس مدنی قانون کی مخالفت اور خلاف ورزی کا مشاہدہ کریں گے۔ ہم خود اپنی آنکھوں سے اس بات کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ

اگر راہنما پولیس وغیرہ اور جرمانہ نہ ہوتو بہت کم ہی لوگ لال بتّی، ممنوعہ جگہ پر گاڑیوں کا پارک کرنا، یک طرفہ راستے سے نہ گذرنا ان سب قوانین کی رعایت کوئی بھی نہیں کرے گا، جو چیز چوروں اور قاتلوں کو ان کے کام سے خوف زدہ کرتی ہے زندان اور قتل کا ڈر ہے اگر یہ ڈر نہ ہو تو لوگوں کے مال و دولت کو آرام سے لوٹ لیں اور ان لوگوں کو قتل کر دیں، بس اسی وجہ سے حکومتوں کا ایک سب سے اہم اور بنیادی کام جزائی قانون کا بنانا اور اس کو جاری کرنا ہے اس قانون کے بغیر اجتماعی نظم اور حکومت کا نظم و نسق کوئی معنی نہیں رکھتا ہے۔

دافعہ، جزائی قوانین کی فطری ماہیت ہے

یہ فطری بات ہے کہ جزائی قانون کے لاگو ہونے کے لئے دافعہ کا ہونا ضروری ہے؛ کیونکہ کوئی بھی قید، کوڑے اور جرمانے سے خوش نہیں ہوتا ہے اور یہ سب کام سخت اور درشت ہیں چاہے یہ سب مسکراہٹ اور کشادہ روئی کے ساتھ انجام دیئے جائیں؛ اگر کوئی انسان غلط کام کئے ہو اس سے بہت ہی ادب اور مسکراہٹ کے ساتھ کہا جائے مہربانی کر کے پندرہ سال اس قید خانہ میں محبوس ہوجایئے؛ یا یہ کہیں کہ ذرا مہربانی کر کے اپنے جسم سے کپڑے کو ہٹایئے تا کہ اس جسم پر سو کوڑے لگائے جائیں، یا یہ کہا جائے مہربانی کر کے اپنی گردن کو آگے بڑھایئے تا کہ اس کو کاٹا جائے تو یہ مسکراہٹ اور احترام کسی چیز کو نہیں بدلے گا اور جن کاموں میں ذاتی طور پر خشونت اور نفرت موجود ہے ان کے اثر کو نہیں بدلے گا؛ کس کو یہ آرزو ہے کہ پندرہ

سال بیوی، بچے اور دوستوں سے دور قید خانوں میں جا کر زندگی بسر کرے؟ اگر ایک پولیس افسر بہت ہی اچھے اخلاق، نہایت ادب اور عزت واحترام کے ساتھ ہم کو صرف لال بتی سے گذرنے کی وجہ سے نا قابل معافی پانچ ہزار روپئے کا جرمانہ کردے تو ہم اس بات پر ناخوش ہوتے ہیں؛ اگر چہ ہم زبان سے کچھ نہ کہیں لیکن دل ہی دل میں ضرور اس کو برا بھلا کہیں گے اب اگر جرمانہ پانچ لاکھ روپئے ہو یا قید خانہ کی سزا، کوڑے اور جسمی اذیت کے ساتھ ہو تو ایسی جگہوں پر دافعہ کا پایا جانا لازمی ہے؛ بہر حال کوئی بھی انسان جزائی قوانین میں خشونت اور ذاتی دافعہ کا انکار نہیں کر سکتا ہے اور جیسا کہ میں نے اس سے پہلے بھی عرض کیا ان جیسے قوانین کے بغیر حکومت کا ہونا بھی ناممکن ہے؛ لہٰذا ساری حکومتیں لازمی اور فطری طور پر دافعہ اور خشونت رکھتی ہیں۔

البتہ ممکن ہے یہ کہا جائے کہ عرف عام میں خشونت کا اطلاق اس جگہ پر ہوتا ہے جہاں جسمانی اذیت اور تکلیف ہو مثلاً کسی کا ہاتھ کاٹا جائے؛ یا کسی کو مارا جائے لیکن پھر بھی ہر حال میں جہاں جرمانہ، قید خانہ اور اس جیسی سزائیں ہیں، اگر وہاں خشونت کا اطلاق نہ ہوتا ہو تو کم سے کم تھوڑا بہت دافعہ ضرور پایا جاتا ہے اور اکثر لوگ اپنے متعلق اس طرح کی سزاؤں سے راضی اور خوش نہیں ہوتے ہیں؛ لہٰذا حکومت، جزائی قانون کے بغیر ممکن نہیں ہے اور جزائی قوانین ہمیشہ خشونت اور دافعہ کا پہلو اپنے دامن میں رکھتے ہیں۔ اور حکومت بغیر دافعہ کی طاقت کے، صرف قوت جاذبہ رکھتی ہو ایسا نہیں ہو سکتا ہے اور بغیر اس کے حکومت بیکار ہے، کیونکہ حکومت کا ایک اصلی اور اہم مقصد یہ ہے کہ اگر کوئی انسان قانون کو اختیار کرنے اور اس پر عمل

کرنے کے لئے تیار نہیں ہے تو اس کو زبردستی اس کام کے لئے مجبور کیا جائے، تاکہ وہ قانون پر عمل کرے؛ البتہ یہ زبردستی اور سختی بہت سے مراحل اور مراتب رکھتی ہے کبھی جرمانہ ہے، کبھی قید خانہ، کبھی جلاوطنی اور کبھی کوڑے مارنا ہے اور سب سے آخری حد قتل اور پھانسی ہے۔

عمل کے شخصی اور اجتماعی پہلو کے درمیان فرق پر توجہ

اس بنا پر دافعہ اس جگہ فائدہ مند ہے جہاں پر اجتماعی قوانین کی مخالفت پیش آتی ہو اور جب تک کوئی برا کام شخصی، فردی اور خصوصی پہلو رکھتا ہو اور اس میں کوئی بھی اجتماعی پہلو نہ پایا جاتا ہو، حکومت کو سزا دینے یا دافعہ کا کوئی حق حاصل نہیں ہے؛ البتہ اس بات کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ اگر کوئی شخص اکیلے میں گناہ انجام دے رہا ہے اور وہ یہ چاہتا ہو کہ کوئی بھی اس کے گناہ سے واقف نہ ہو اور یہ حقوق مدنی قانون کے اعتبار سے بھی مجرم ہے اگر کسی صورت سے یہ گناہ قاضی کے نزدیک عدالت میں ثابت ہو جائے تو اس انسان پر اسلامی دستور کے مطابق سزا اور حد جاری ہوگی؛ اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر چہ اس نے یہ گناہ تنہائی میں انجام دیا ہے اور اس نے اس بات کی کوشش کی کہ کوئی اس کے گناہ سے مطلع نہ ہو؛ لیکن چونکہ کسی طریقے سے لوگ اس کے اس گناہ سے واقف ہو گئے ہیں اور یہ بات عام ہو گئی ہے اور اس صورت میں اس گناہ نے اجتماعی رخ اختیار کر لیا ہے تو اس لحاظ سے کہ ممکن ہے اس کے اجتماعی اثرات تباہ کن ہوں، اس وجہ سے اس پر سزا ہوگی؛ یہاں تک کہ اگر ایک انسان بھی

اس کے اس غلط کام سے واقف ہوگیا، اس وقت بھی اس پر (اشاعہ فاحشہ) برے عمل کو پھیلانے کا عنوان صدق کر رہا ہے جو کہ اسلامی قانون کے مطابق حرام اور ممنوع ہے؛ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے" ان الذین یحبّون ان تشیع الفاحشۃ فی الذین آمنوا لھم عذاب الیم فی الدّنیا والآخرۃ" (۱) جو لوگ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ مومنوں کے درمیان برے کام کو پھیلائیں؛ ان کے لئے دنیا اور آخرت دونوں جگہوں پر سخت دردناک عذاب ہے۔

....

(۱) سورہ نور: آیہ ۱۹۔

غیر اسلامی ممالک اور وہاں کے لوگوں کے ساتھ اسلام کا برتاؤ

وہ لوگ جو کہ اسلامی ممالک اور اس کی حدوں سے باہر زندگی بسر کر رہے ہیں ان کے متعلق جاذبہ اور دافعہ کا کیا حکم ہے، یہ ایک تفصیلی اور تفصیلی بحث ہے جس کے لئے بہت زیادہ وقت چاہئے؛ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے، چونکہ آئیندہ جلسے سے ایک نئی بحث شروع کرنے کا ارادہ ہے، لہذٰا اس بحث کو مکمل کرنے کے لئے یہاں پر مختصر طور پر] جو اس بحث سے مربوط ہے [اس کو پیش کیا جا رہا ہے۔

جو لوگ اسلامی مملکت کے باہر زندگی بسر کر رہے ہیں وہ دو حال سے خالی نہیں ہیں؛ یا وہ لوگ ہیں جو کہ اسلام کے خلاف سازش اور تخریب کرتے ہیں اور اسلامی حکومت کو کمزور کرنے کی چال چلتے رہتے ہیں؛ یا ایسے نہیں ہیں؛ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جائے کہ ایسے لوگ ہیں جو

کہ اسلامی ممالک اور وہاں کے لوگوں سے دشمنی رکھتے ہیں اور ان کے لئے اذیت کا سبب بنتے ہیں یا ایسے لوگ نہیں ہیں۔ اگر باہری ممالک کے لوگ مسلمانوں کی اذیت اور ان کو کمزور اور نابود کرنے ارادہ نہ رکھتے ہوں تو اس صورت میں مسلمان ان کے خلاف کوئی بھی تجاوز کا حق نہیں رکھتے ہیں اور مسلمانوں کو چاہیئے کہ ان کے ساتھ عدل واحسان کا برتاؤ رکھیں ،قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

" لا ینھاکم اللہ عن الّذین لم یقاتلو کم فی الدین ولم یخرجو کم من دیارکم ان تبرّوھم و تقسطوا الیھم " (۱)

وہ تمھیں ان لوگوں کے بارے میں جنھوں نے تم سے دین کے بارے میں جنگ نہیں کی ہے اور تمھیں وطن سے نہیں نکالا ہے اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان کے ساتھ نیکی اور انصاف کرو، جب تک وہ لوگ تم سے دشمنی اختیار نہ کریں اور تمھارے خلاف سازش نہ رچیں؛ تم کو چاہیئے کہ ان کے ساتھ احسان کرو؛ یہاں تک کہ اپنے ملک میں رہنے والے افراد سے بھی زیادہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو، تا کہ وہ اسلام کی طرف مائل ہوں۔ ان جگھوں میں جہاں زکواۃ خرچ کی جاسکتی ہے ان میں ایک وہ جگہ بھی ہے کہ اصطلاح میں جس کو" مولّفۃ القلوب" کہا جاتا ہے یعنی وہ کفار جو کہ اسلامی ملک کے اطراف میں رہتے ہیں؛ صرف اس لئے کہ ان کے دلوں میں مسلمانوں اور اسلام کی دوستی اور محبت داخل ہو زکواۃ کے مدسے ان کو ہدیہ وغیرہ دیا جائے لہٰذا کفار کے اس گروہ کی بہ نسبت نہ صرف یہ کہ خشونت اور دافعہ نہ رکھنے کا حکم ہے؛ بلکہ انکے متعلق جاذبہ بھی اختیار کرنا چاہیئے۔

لیکن وہ لوگ جو کہ مسلمان اور اسلام کے خلاف دشمنی اور سازش اختیار کرتے ہیں؛ ان کے ساتھ تو خداوند عالم نے فیصلہ کن انداز اختیار کرنے کا حکم دیا ہے،

....

(۱) سورہ ممتحنہ: آیہ ۸۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوتا ہے:

" انّما ینھا کم اللہ عن الذین قاتلو کم فی الدین واخرجو کم من دیارکم وظاھروا علیٰ اخراجکم ان تولوھم "(۱)

وہ تمھیں صرف ان لوگوں کی دوستی سے روکتا ہے جنھوں نے تم سے دین میں جنگ کی ہے اور تمھیں وطن سے نکال باہر کیا ہے اور تمھارے نکالنے پر دشمنوں سے مدد کی ہے۔

پہلے گروہ کے لئے جاذبہ رکھو، لیکن یہ گروہ کہ جو اسلام اور مسلمان کے دشمن ہیں ان کے ساتھ پوری طرح سے دافعہ رکھو، ان کی زندگی کو قید کیے رہو اور ان کو ہلنے کی مہلت نہ دو اس بات کی پھر تاکید کروں گا کہ دافعہ کا سہارا فقط ان کے لئے استعمال کر لینا چاہئے جو لوگ کھلے طور اور عام طریقے سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کام کرتے ہیں اور اس گروہ کے علاوہ کسی کے متعلق ایسا حکم نہیں ہے؛ یہاں تک کہ قران میں حکم ہے کہ جنگ کا عالم ہو اور کفار کا لشکر ایک طرف اور مسلمانوں کا لشکر دوسری جانب اور اگر جنگ بھی ہو رہی ہو؛ اگر مشرکین میں سے کوئی ایک شخص سفید پرچم اٹھائے] جو کہ صلح اور جنگ بندی کی نشانی ہے [یا کسی طرح بھی آپ تک پیغام پہونچائے کہ میں ایک علمی سوال کرنا چاہتا ہوں اور یہ بات میرے نزدیک ظاہر نہیں ہو

پا رہی ہے کہ اسلام حق ہے یا نہیں اور میری آپ سے جنگ حق اور صحیح ہے یا غلط ہے؟ اسلام یہاں پر کہتا ہے مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ اس شخص کو حفاظت کے ساتھ اسلامی کیمپ میں لا یا

....

(۱) سورہ ممتحنہ: آیہ ۹۔

جائے، اور وہاں بیٹھا کر اس کے سوال کا جواب دیا جائے اور اس بات کی کوشش کی جائے کہ دلیل و برہان سے اس کو مطمئن کیا جائے اور اس کے بعد بھی اگر وہ واپس ہونا چاہے تو اس کو اسی طرح پوری حفاظت کے ساتھ بغیر کسی اذیت کے اس کی پہلی جگہ جو کہ اسلامی لشکر کی پہونچ سے باہر ہو وہاں تک پہونچا دیا جائے؛ پھر اگر وہاں اس نے جنگ کا ارادہ کیا تو اس کے ساتھ جنگ کی جائے؛ ورنہ اس کو چھوڑ دیں اور وہ جہاں جانا چاہے وہاں چلا جائے، قرآن مجید میں خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے "وان احد من المشرکین استجارک فاجرہ حتیٰ یسمع کلام اللّٰہ ثمّ ابلغہ ما منہ" (۱) اگر مشرکوں میں سے کوئی تم سے پناہ کا طلب گار ہو تو اس کو پناہ دے دو تا کہ وہ خدا کے کلام کو سنے؛ پھر اس کے بعد اس کو امن کی جگہ پر واپس کر دو۔ آپ دنیا کے کسی حقوقی نظام میں ایسی چیزوں کا سراغ اور نشان رکھتے ہیں؟ اسلام یہ کہتا ہے مسلمان طالب علم تو اپنی جگہ اگر کوئی دشمن کافر کہ جس کے ہاتھ میں تلوار ہے اور وہ تم سے جنگ کر رہا ہے اور اسی جنگ کی حالت میں وہ تم سے کوئی سوال کرنا چاہتا ہے تو اسلام کا حکم یہ ہے کہ تم اس کا جواب دو۔ ہم ایسے مکتب و مذہب کے پیرو ہیں۔ کون کہتا ہے کہ اسلام اور اس کا نظام حکومت سوالوں کے جواب نہیں دیتا اور سوال کا جواب تلوار سے دیتا ہے؟ وہ اسلام جو کہ کافر (اس حال میں بھی کہ

تلوار اس کے ہاتھ میں ہو اور جنگ کا عالم ہو)

....

(۱) سورہ توبہ آیہ ٦.

کے ساتھ اس طرح کے سلوک کا حکم دیتا ہے وہ خود مسلمانوں کے درمیان آپس میں اس کے برخلاف کیسے دستور اور حکم دے گا؟

اسلام کی پہلی سیاست یہ ہے کہ وہ پہلے دلیل ،موعظہ اور جدال احسن کا حکم دیتا ہے؛ لیکن اگر بات دشمنی اور تخریب تک پہونچ جائے اور اس بحث کا کوئی علمی جواب نہ ہو اور وہ لوگ اسلام اور اس حکومت کے خلاف سازش میں لگے ہوں اور اسلامی حکومت کو کمزور کرنے کی کوشش میں لگے ہوں تو ان کے مقابلہ میں سوئی برابر بھی نہیں جھکنا چاہیئے اور ان پر ذرہ برابر بھی رحم و کرم نہیں کرنا چاہیئے، بلکہ ان کا پوری سختی اور فیصلہ کن انداز میں سامنا کرنا چاہیئے۔

قوت دافعہ یا سختی کے استعمال کے سلسلے میں اسلام کا نظریہ

لہٰذا اسلام صرف دو جگہوں پر خشونت کو اختیار کرنے اور قوت دافعہ کا سہارا لینے کا حکم دیتا ہے۔
پہلی وہ جگہ جہاں مسلمان یا غیر مسلمان اسلامی معاشرہ میں دوسرے کے حقوق غصب کر رہے ہوں اور کسی بندۂ خدا پر ظلم و ستم ہوتا ہو یا کسی کے ساتھ خیانت کی جا رہی ہو دوسری وہ جگہ جہاں اسلامی مملکت کے باہر اسلام اور اسلامی ملکوں کے خلاف دشمنی کی جا رہی ہو۔اور

سازش رچی جارہی ہو۔ البتہ ان سزاؤں کی حد اور حدود کیا ہیں، اور کتنے اور کیسے ہیں؟ جو کہ قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں یا دوسرے کے حقوق کو غصب کرنے والوں کے متعلق ہوتی ہیں، عقل بہت سی جگہوں پر ان کو سمجھنے سے قاصر ہے اور یہ سزائیں براہ راست خود خداوند عالم کی طرف سے اور صاحب شریعت کی طرف سے معین ہوئی ہیں، لیکن سزا جو بھی ہو جب سزا معین ہو جائے تو یہ سزا پوری سختی کیخلاف ورزی کرنے والوں کے متعلق جاری کرنا چاہیئے۔ جو لوگ غلط اور برے کام انجام دیتے ہیں ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:"

الزانية والزانی فاجلدوا کل واحد منهما مائة جلدة ولا تاخذ کم بهما رافة فی دین الله ان کنتم تومنون بالله والیوم الآخر ولیشهد عذابهما طائفة من المومنین'(۱)

زنا کرنے والے مرد اور عورت کو سو سو تازیانے مارو؛ اگر تم خدا اور قیامت پر ایمان رکھتے ہو تو احکام الٰہی میں ان کے ساتھ کوئی نرمی نہ کرو؛ اور جس وقت ان کو یہ سزا دو تو مومنین کا گروہ گواہ کے طور پر وہاں حاضر رہے ایسا خلاف اور غلط کام کرنے والے کے ساتھ جتنی بھی سختی ممکن ہو سکے اسے انجام دیا جائے اور کوئی بھی مسلمان جو واقعی طور سے خدا اور قیامت پر ایمان رکھتا ہو ذرہ برابر بھی اس کو اس خطا کار پر رحم اور مہربانی نہیں کرنی چاہیئے، اس سزا کی شدّت و سختی اس وقت اور زیادہ ہو جاتی ہے جبکہ یہ کوڑے لوگوں کے سامنے مارے جائیں اور عوام ان دونوں کی سزا پر گواہ ہوں تو یہ بات فطری ہے کہ اس کڑی اور سخت سزا کے برداشت کے ساتھ

ساتھ وہ بے آبرو بھی ہوجاتے ہیں لہٰذا ان کو اس طرح سے سزا دی جائے کہ کوئی دوسرا شخص اس طرح کے کام کی جرائت نہ کرسکے۔

....

(۱) سورہ نور آیہ ۲.

اسلام میں جاذبہ اور دافعہ کی بحث کا خلاصہ

اس حصّہ کی بحث کا نتیجہ اور خلاصہ یہ ہوا کہ اسلام میں جاذبہ اور دافعہ کی حد یہ ہے کہ اگر کسی کے حق پر اسلامی معاشرہ میں چاہے وہ مادی حق ہو یا معنوی، بالواسطہ یا بلا واسطہ طریقے سے تجاوز کیا جائے یا اسلامی حکومت کی حدود سے باہر رہ کر اسلام اور اسلامی حکومت کے خلاف سازش ہو؛ تو ان دو صورتوں میں ایسا کرنے والے کے ساتھ خشونت اور سختی کرنی چاہیئے، اس کے علاوہ بقیہ جگھوں پر صرف جاذبی رخ اختیار کرنا چاہیئے یا پھر نرم لہجہ اور رفتار کے ساتھ جس قدر کم سے کم امکان ہو جاذبہ کے ساتھ دافعہ کی قوت کو استعمال کرنا چاہیئے؛ جس جگہ دافعہ اور خشونت کی اجازت ہے اس کی حد اور اس کے طریقہ کو بہت سی جگھوں پر خداوند عالم نے خود براہ راست معین فرمادیا ہے یا ایک کلی قانون کو اس نے بتادیا ہے(کہ اسی قانون کے تحت سزا دی جانی چاہیئے)لہٰذا کسی بھی حال میں خشونت کو اختیار کرتے وقت ان حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہیئے۔قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

" تلك حدود الله فلا تعتدوها ومن يتعدّ حدود الله فاو لئك هم الظالمون"(۱)

یہ احکام اللہ کے حدود ہیں

....

(۱) سورہ بقرہ آیہ ۲۲۹

لہذا اس سے تجاوز نہ کرنا اور جو لوگ اللہ کے حدود سے آگے بڑھ جاتے ہیں وہی للوگ ظالم ہیں۔

آخر میں ایک مرتبہ پھر پچھلے جلسے کی باتوں کو دہراؤں گا۔ اسلام میں جاذبہ اور دافعہ کی بحث تین شکل اور تین عنوان سے قابل تصور ہے:

(۱) اسلام کے سارے احکام اور معارف ایسے ہیں کہ دیندار افراد کے لئے صرف بعض چیزوں کے جذب کا سبب بنتے ہیں یا ایسے ہیں کہ ان کے لئے صرف بعض چیزوں کے دفع کا سبب بنتے ہیں یا ان میں دونوں صورتیں ہیں؟

(۲) اسلام کے تمام معارف مسائل ایسے ہیں کہ عام انسانوں کے لئے جاذبہ رکھتے ہیں یا ایسے ہیں کہ ان کے لئے دافعہ رکھتے ہیں؟

(۳) اسلام مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کو اپنی طرف جذب کرنے کے لئے جاذبہ رکھنے والے طریقے کا سہارا لیتا ہے یا پھر دافعی روش کو استعمال کرتا ہے یا ان دونوں طریقوں کا سہارا لیتا ہے؟ جو کچھ ہم نے اس بحث میں زیادہ توجہ کا مرکز بنایا حقیقت میں وہ تیسرے سوال کا جواب تھا اور اسی تیسری قسم پر زیادہ بحث رہی اور پہلے دو سوالوں سے متعلق زیادہ بحث نہیں ہوئی، چونکہ اور دوسرے موضوعات کی اہمیت کی بنا پر آئندہ جلسوں سے ایک نئے موضوع کو

شروع کرنے کا ارادہ ہے؛ لہٰذا جاذبہ اور دافعہ کی بحث کو یہیں پر ختم کرتے ہیں: بعد میں کبھی اس بحث کو مکمل کریں گے۔ انشاءاللہ۔

سوال اور جواب

سوال: اسلام میں جاذبہ اور دافعہ دونوں پائے جاتے ہیں اس سلسلہ میں کوئی بحث نہیں ہے لیکن لفظ خشونت کے مفہوم کے بارے میں دو پہلو سے دقت کرنے کی ضرورت ہے ۔پہلے یہ کہ کیا یہ مفہوم ایک دینی اصطلاح ہے اور قرآن و حدیث میں یہ استعمال ہوا ہے؟ میری نگاہ میں ایسا نہیں ہے؛ کیونکہ قرآن میں مطلق طور سے یہ لفظ استعمال نہیں ہوا ہے اور روایات میں بھی تقریباً یہ لفظ نہیں آیا ہے یعنی بہت ہی کم استعمال ہوا ہے خلاصہ یہ کہ ایسا نہیں ہے کہ قرآن و روایات کے الفاظ میں خشونت کو فضیلت کے طور پر پیش کیا گیا ہو، فارسی زبان میں بھی کلمہ خشونت اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا؛ اس کے مساوی جو لفظ استعمال ہوتا ہے وہ بے رحمی کا ہے اور یہ قاطعیت سے جدا ہے قاطعیت (قانون کی سخت پابندی) لفظ ایک اچھا عنوان رکھتا ہے لہذا خشونت کو اس کے مترادف نہیں سمجھنا چاہئے۔ ایک فوجی افسر ممکن ہے قاطع ہو اور کبھی ممکن ہے کہ بہت ہی خشن (درشت) ہو اور یہ دونوں لفظ ایک نہیں ہیں، ممکن ہے انسان ایک جذباتی کام مثلاً چومنے کو بھی خشونت کے ساتھ انجام دے۔

دوسرا نکتہ جو لفظ خشونت سے متعلق ہے وہ یہ کہ فرضاً ہم اس بات کو قبول کر بھی لیں کہ یہ اصطلاح قرآن و روایات اور اسلامی الفاظ میں استعمال ہوئی ہے اور اس کو بھی قبول کرلیں کہ

خشونت کا مفہوم قاطع کے مترادف ہے اور ایک اچھا پہلو بھی رکھتا ہے لیکن حالات اور مسائل کو دیکھتے ہوئے عقل ونقل دونوں کے اعتبار سے اس لفظ کو استعمال کرنا صحیح نہیں ہے؛ لہذٰا اہم کو اس کے عوض دوسرے الفاظ کو استعمال کرنا چاہئے؛ عقلی لحاظ سے اس بنا پر کہ عقل یہ کہتی ہے کہ جس سماج اور ماحول میں آپ گفتگو اور کلام کر رہے ہیں وہاں پر خشونت کے معنی اچھے نہیں سمجھے جاتے ہیں اور اس سے بے رحمی کے معنی سمجھے جاتے ہیں؛ اس معنی کو یہاں استعمال کر کے دافعہ کو بلا وجہ نہیں لانا چاہئے؛ جب کہ دوسرے لفظ کو ہم اسی معانی کے لئے استعمال کر سکتے ہیں اور اس طرح آسانی سے اس مشکل کو حل کر سکتے ہیں۔ اور نقل] قرآن وحدیث [کے اعتبار سے اس طرح کہ قران میں ارشاد ہو رہا ہے:" یا ایھا الذین آمنوا لاتقولوا راعنا و قولوا انظرنا" (۱) اے وہ لوگو! جو کہ ایمان لائے ہو" راعنا" نہ کہو بلکہ" انظرنا" کہا کرو۔ کیونکہ دشمن راعنا کہہ کے غلط معنی مراد لیتے تھے، اسی مراد کو دوسرے لفظ کے ذریعہ لے سکتے ہیں لہذٰا انظرنا کہو تا کہ دشمن جو غلط معنی مراد لے رہا ہے اس کا سدباب کیا جا سکے۔

دوسرے لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ خشونت کی بحث کبھی فعلی اعتبار سے حسن وقبح رکھتی ہے اور کبھی فاعلی اعتبار سے حسن وقبح رکھتی ہے مثلاً قتل کرنا یہ قتل، ایک کام اور فعل ہے جو کہ ماہیت کے اعتبار سے خشن اور سخت ودرشت ہے، ایک مرغے یا بھیڑ کا سر جدا

....

(۱) سورہ بقرہ: آیہ ۱۰٤۔

کرنا ماہیت کے لحاظ سے سخت اور خشن کام ہے لیکن کبھی بحث فاعل سے مربوط ہوتی ہے

فاعل وہ ہے جو کہ اس مرغ یا بھیڑ کا سر جدا کرنا چاہتا ہے، اب اس کام کو ممکن ہے وہ بے رحمی اور خشونت کے ساتھ انجام دے؛ یا یہی کام وہ بغیر خشونت کے انجام دے ہماری اس وقت بحث فاعلی خشونت میں ہے نہ کہ فعلی خشونت میں ؛یعنی احکام اسلامی کو جاری کرنے میں ہمیں سخت اور خشن چہرہ ظاہر نہیں کرنا چاہئے ؛ ہم کو رسول اکرم کی سیرت دیکھنا چاہئے آپ عالمین کے لئے رحمت تھے اور اخلاق حسنہ رکھتے تھے آپ اخلاق کے بلند مرتبہ پر فائز تھے لیکن پھر بھی آپ اپنی جگہ پر کفّار اور دشمنوں کے مقابلہ میں شدّت وقاطعیت اختیار کرتے تھے ؛لیکن کبھی بھی آپ کے فعل میں خشونت کو نہیں دیکھا گیا۔

خلاصہ،سوال یہ ہے کہ جب لفظ خشونت تمام زبانوں میں بے رحمی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور اس سے منفی اثر پڑتا ہے تو بے وجہ ہم اس کے استعمال پر زور دیتے ہیں اور دافعہ ایجاد کرکے دشمن کے لئے غلط فائدہ اٹھانے کا راستہ ہموار کررہے ہیں ؛ جب کہ اس کی جگہ پر دوسرا لفظ استعمال کرکے ہم اس مشکل کو حل کرسکتے ہیں۔

جواب: البتہ اس سوال کے جواب میں جو مطالب بیان کئے جائیں گے وہ اسی خشونت کے سلسلے میں جو ٹیلیویژن پر مناظرہ ہوا تھا اس میں بیان کئے جا چکے ہیں،اور جو دوست ان مباحث کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں وہ ہفتہ نامہ "پرتو" میں ملاحظہ کرسکتے ہیں اس میں یہ مطالب چھپ چکے ہیں،اور یہاں پر جتنا ممکن ہے اس کی توضیح کچھ اس طرح ہے:

کبھی بحث اس میں ہے کہ یہ لفظ ہماری تہذیب اور کلچر میں کیا معنی رکھتا ہے اور کبھی بحث اس

میں ہے کہ یہ لفظ مختلف عرف، سماج اور تہذیب میں کس معنی میں استعمال ہوتا ہے؛ اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ ہمارے کلچر میں خشونت کا لفظ بے رحمی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے تو ظاہر سی بات ہے کہ پہلے رحم کے معنی کو واضح کریں تا کہ اس کے مقابلہ میں جو لفظ بے رحمی اور خشونت کا ہے اس کے معنی و مفہوم واضح ہو جائے۔ اگر چہ ہماری تہذیب میں ممکن ہے کہ خشونت کا مفہوم اکثر بے رحمی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے لیکن عرف اور دوسرے کلچر میں ایسا نہیں ہے جیسے حقوقی اور سیاسی اصطلاح میں خشونت کے معنی یہ نہیں ہیں یہ لفظ بنیادی طور پر عربی ہے عربی کی کسی لغت میں بھی کسی نے خشونت کے معنی میں بے رحمی نہیں لکھا ہے، بلکہ خشن یعنی سخت و درشت کے معنی میں ہے خشونت یعنی سختی اور درشتی، اس کے مقابلہ میں ل ی ن کا لفظ استعمال ہوتا ہے جو کہ نرم کے معنی میں ہے لہٰذا عربی لغت کے مطابق خشونت رحم کے مقابل نہیں ہے تا کہ بے رحمی کے معنی میں ہو، بلکہ یہ محکم اور سخت کے معنی میں ہے جو کہ لینہ اور نرمی کے مقابل ہے۔ البتہ عام طور سے یہ ہوتا ہے کہ جب مفہوم طبیعی اور مادی علوم سے انسانی اور اجتماعی علوم کی طرف منتقل ہوتا ہے تو اس کے نئے مصداق ہو جاتے ہیں، لیکن ہر حال میں پھر بھی لغوی معنی کی اصل اسی طرح باقی رہتی ہے۔

اور جو سوال میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ لفظ اصلاً قرآن میں استعمال نہیں ہوا ہے اور روایات میں بھی بہت کم آیا ہے اور ہر حال میں قرآنی اور روائی اعتبار سے اس کے لئے کوئی فضیلیت بیان نہیں کی گئی ہے تو اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے۔ اگر چہ خود قرآن میں مادہ "خ ش ن" اور خشونت کا لفظ نہیں آیا ہے لیکن اس کے ہم معنی لفظ استعمال ہوا ہے اور

ادبیات اور زبان کے دستور کے مطابق ہم اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ ہم معنی اور مرادف لفظ کو ایک دوسرے کی جگہ استعمال کر سکتے ہیں؛ لہٰذا اگر لفظ خشونت کے مترادف اگر کوئی لفظ قرآن میں آیا ہو تو یہ دعویٰ کہ قرآن میں خشونت کے مفہوم کو بیان نہیں کیا گیا ہے، صحیح نہیں ہے؛ خشونت کے مترادف (ہم معانی) لفظ جو قرآن کریم میں آئے ہیں وہ لفظ "غلظت" اور اس کا مادہ ((غ ل ظ)) ہے، سورہ توبہ میں ارشاد ہو رہا ہے:

"ولیجدوا فیکم غلظة"(۱)

اور وہ (کفّار) تم میں خشونت اور غلظت کا احساس کریں، یا قرآن کریم میں دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

"یا ایها النبیّ جاهد الکفّار والمنافقین واغلظ علیهم وماؤهم جهنّم "(۲)

اے نبی! کافروں اور منافقوں سے جہاد کیجئے اور ان کے لئے سخت رویہ اپنایئے اور ان لوگوں کی جگہ جہنم ہے۔ یہ آیہ قرآن مجید میں دو بار، سورہ توبہ اور سورہ تحریم میں آئی ہے۔ یا دوسری جگہ سورہ آل عمران میں فرماتا ہے:

" فبما رحمة من الله لنت لهم ولو کنت فظّاً غلیظ القلب لانفضوا من حولك" (۳)

اے پیغمبر! یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ تم ان (۱) سورہ توبہ: آیہ ۱۲۳۔

....

(۲) سورہ تحریم: آیہ ۹۔

(۳) سورہ آل عمران: آیہ ۱۵۹۔

لوگوں کے لئے نرم ہو ورنہ اگر تم بدمزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ تمھارے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے۔

اور پھر یا اسی قرآن کریم میں ارشاد ہو رہا ہے:

"علیھا ملائکۃ غلاظ شداد" (۱)

یعنی اس (جہنم کی آگ) پر سخت اور خشن فرشتے معین ہیں؛ پورے طور سے (غ ل ظ) کا مادہ ۱۳ بار قران میں استعمال ہوا ہے اور جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا غلظت اور خشونت مترادف یعنی ہم معنی ہیں اور پورے طور پر ایک معنی رکھتے ہیں اور جب لفظ غلظت قران مجید میں استعمال ہوا ہے تو یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ خشونت کا مفہوم قرآن میں نہیں آیا ہے؛ اسی طرح ایک جگہ پر رحم کا مفہوم شدّت کے مفہوم کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے، قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

"محمد رسول اللہ والذین معہ اشدّاء علی الکفّار رحماء بینھم" (۲)

محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت اور آپس میں مہربان اور رحم دل ہیں۔

روایات میں بھی خشن لفظ استعمال ہوا ہے اور کئی جگہوں پر فضیلت کے طور پر استعمال ہوا ہے مثلاً حضرت علی کے بارے میں ہے کہ آپ اللہ کی ذات میں یعنی اس کے حقوق ادا کرنے میں خشن تھے "خشن فی ذات اللہ" (۳) اس اعتبار سے لغت، آیت اور روایات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ سوال میں جس چیز کا دعویٰ کیا گیا

....

(١) سورہ تحریم: آیہ ٦۔

(٢) سورہ فتح: آیہ ٢٩۔

(٣) بحارالانوار: جلد ٢١، روایت دہم، باب ٣٦۔

ہے وہ صحیح نہیں ہے لیکن پھر بھی لغوی بحث اور استعمال کے موارد سے صرف نظر کرتے ہوئے یہ سوال کہ خشونت کے معنی بے رحمی ہیں یا نہیں؟ میں آپ سے سوال کروں گا: جیسا کہ اسلام کے جزائی قانون میں ہے؛ اگر کوئی کسی گناہ کا مرتکب ہوا ہے اور اس کے بدلے اس کا داہنا ہاتھ قطع کیا جائے، اور اس کے بائیں پیر کو بھی کاٹا جائے اور برادری سے اس کا بائیکاٹ بھی کیا جائے اور کوئی اس کا احترام نہ کرے، یہ بے رحمی ہے یا رحم؟ یا اگر جیسا کہ اسلام کے جزائی قانون میں ہے، آگ روشن کرکے کسی کو سزا کے طور پر اس آگ میں ڈالا جائے اور اس کو اس میں جلایا جائے، یا اس کے ہاتھ اور پیر کو باندھ کر پہاڑ سے نیچے پھینک دیا جائے؛ یا ایک دینار طلا کے برابر چوری کے سبب کسی کی چار انگلیاں کاٹی جائیں؛ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کام رحم ہے یا بے رحمی ہے؟

سوال میں فعلی اور فاعلی خشونت اور فعلی اور فاعلی حسن و قبح میں تفریق و تفکیک کی گئی ہے اور اسی طرح قاطعیت اور خشونت میں فرق کو قبول کیا گیا ہے، لیکن مثلاً اگر کوئی لال بتّی جلنے کے بعد عبور کرے اور پولیس اس کو گرفتار کرلے اور سلام و احوال پرسی کے بعد مسکراتے ہوئے ادب کے ساتھ اس سے کہے کہ آپ نے قانون کی خلاف ورزی کی ہے لہٰذا پانچ ہزار روپۓ

آپ پر جرمانہ کیا جاتا ہے، یہاں پر قاطعیت ہے خشونت نام کی کوئی چیز نہیں ہے، لیکن بحث اس میں ہے کہ جس خشونت کے ہم اسلام میں قائل ہیں وہ صرف قاطعیت نہیں ہے؛ بعض اعمال ماہیت کے اعتبار سے خشن ہیں اوران کو قاطعیت کے ساتھ انجام دینے میں ہمیشہ ایک طرح کی خشونت پائی جاتی ہے: جس وقت جلاّد شمشیر اور تلوار کے ساتھ آتا ہے اور کسی کا سر جدا کرتا ہے اور خون کا فوّارہ جاری ہوتا ہے، اس کام کی ماہیت ہی ایسی ہوتی ہے کہ اس کو ہنسی خوشی اور کشادہ روئی کے ساتھ انجام نہیں دیا جاسکتا؛ یہ منظر ہی ایسا ہے کہ بہت سے لوگ اس کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتے؛ اور اس منظر کو دیکھنے سے ہی ان کے چہرہ کا رنگ اڑ جاتا ہے، ہنسنا، مسکرانا بھول جاتے ہیں یہاں تک کی بعض لوگ اس کو دیکھ کر بیہوش ہوجاتے ہیں، اس وقت یہ کہنا کیسے ممکن ہے کہ خود اس کام کو انجام دینے والا صرف قاطعیت کے ساتھ لیکن مسکراہٹ اور مہربانی سے اس کو انجام دے؟ یہ فعل ہی درحقیقت خشن ہے اور جو شخص یہ انجام دیتا ہے وہ فطری طور پر خشن اور خشونت کا طرفدار شمار کیا جاتا ہے اور ان جگہوں پر فعلی اور فاعلی خشونت میں فرق پیدا کرنا ناممکن ہے۔

اس کے علاوہ جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں اس کا مورد اور مقام خشونت فاعلی نہیں ہے (یعنی یہ بحث کام کرنے والے کی خشونت سے متعلق نہیں ہے) بلکہ ان کا اعتراض خشونت فعلی سے متعلق ہے؛ وہ لوگ کہتے ہیں کہ جو کام تم لوگ انجام دیتے ہو وہ کام خشن ہے اور اس کو نہیں کرنا چاہئے۔ اگر ہم اس کام کو ہنسی خوشی اور کشادہ روئی کے ساتھ انجام دیں تو بھی مشکل حل نہیں ہونے والی ہے؛ بحث قاطعیت میں اور خشن نہ ہونے میں نہیں ہے بلکہ سارے

اعتراضات انھیں مجازات اور سزاؤں پر ہیں۔اصل میں یہ سارے مطالب عالمی انسانی حقوق کے بیانیہ کی طرف پلٹتے ہیں؛ وہ حقوق جو عالمی انسانی حقوق کے منشور میں ہے اس کا ایک بند یہ ہے کہ جتنی سزائیں بھی خشونت کا سبب بنتی ہیں ان سب کو ختم ہونا چاہیئے۔ ان سزاؤں میں سب سے واضح اور ظاہری سزا جو ہے اور اس پر بہت زیادہ تاکید ہورہی ہے قتل اور پھانسی کی سزا ہے اور اس جیسی سزائیں مثلاً ہاتھ کاٹنا، کوڑے مارنا اور دوسری سزائیں جو کہ جسمانی تکلیف کے ساتھ ہوں؛ آج جب انسانی حقوق کی گفتگو ہوتی ہے اور دنیا کے ممالک خاص طور پر ان کا سرغنہ امریکہ ہم مسلمانوں پر انسانی حقوق پامال کرنے کا الزام لگاتے ہیں ؛ ان لوگوں کا اعتراض یہ نہیں ہے کہ مجرموں کو پھانسی دیتے وقت یا ان کو کوڑا مارتے وقت مسکراتے کیوں نہیں اور سختی کیوں کرتے ہو، بلکہ بات اصل میں ایسی سزاؤں کے وجود کے بارے میں ہے کہ ایسی سزائیں کیوں پائی جاتی ہیں؟ وہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ سزائیں اصل میں اس وقت تھیں جب انسان تمدن اور کلچر نہیں رکھتا تھا؛ لوگ ہمیشہ جنگ کیا کرتے تھے اور ایک دوسرے کو قتل وغارت کرنے میں مشغول رہتے تھے؛ لیکن آج انسان تمدن یافتہ ہو چکا ہے اور سب کے سب باادب ہیں؛ ایک دوسرے کا احترام کرتے ہیں اور فرض کیجئے اگر کسی شہر پر ایٹمی بم بھی گرائیں تو بہت ہی باادب خاموشی کے ساتھ بغیر شور وغل کے وہ لوگ اتمی بم گراتے ہیں اور واپس چلے جاتے ہیں!! آج کے دور میں، یہ خشونت آمیز سزائیں پھانسی اور کوڑے وغیرہ نہیں ہونے چاہئیں، اس طرح کی تبلیغات کی ہوا اتنی مضبوط اور موثر ہے کہ افسوس صد افسوس، بعض وہ لوگ جو کہ روحانی (مولانا) ہیں اور سر پر عمامہ بھی رکھتے ہیں وہ بھی

اس سے متاثر ہو جاتے ہیں اور واضح طور پر اخبارات میں لکھتے ہیں کہ ایسی سزائیں جو کہ انسانیت کے خلاف اور خشونت آمیز ہیں ان کو ختم ہونا چاہیئے؛ البتہ یہ اظہار کوئی نئی بات نہیں ہے، انقلاب کے شروع میں بھی ہم کو یاد ہے جبہہ ملّی کے جو حقوق دان تھے انھوں نے بیانیہ دیا تھا کہ اسلامی قصاص کے قانون خشونت آمیز اور انسانیت کے خلاف ہیں اور ان کو ختم ہونا چاہیئے، ان دنوں حضرت امام خمینی ان باتوں کے مقابلہ میں سختی کے ساتھ کھڑے ہوئے اور آپ نے ان کے مرتد ہونے کا حکم دیا، اور امام خمینی کے فتوے سے وہ اتنا خوف زدہ ہو گئے کہ وہ سالوں اپنے سوراخوں میں چھپے رہے؛ لیکن آج پھر یہ پست اور جسارت سے مملو باتیں اٹھائی جا رہی ہیں اور کھلے عام عمومی جگہوں اور اخبارات میں پیش کی جاری ہیں۔

لہٰذا اب بات اس کام کو انجام دینے والے (فاعل) سے مربوط نہیں ہے کہ کیوں وہ مسکراتا نہیں اور باادب نہیں ہے بلکہ اعتراض ان سزاؤں پر ہے کہ یہ انسانیت کے خلاف اور خشونت آمیز ہیں، سوال یہ ہے کہ یہ سزائیں جن کو وہ لوگ خشونت آمیز جانتے ہیں، ان کو ہونا چاہیئے یا نہیں ہونا چاہیئے؟ وہ لوگ کہتے ہیں کہ خشونت نہیں ہونا چاہیئے ان کی مراد خشونت سے یہی پھانسی، قتل، قصاص اور کوڑے وغیرہ ہیں ہم چاہتے ہیں کہ ان کی باتوں کو غلط ثابت کریں، لہٰذا ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں بچتا ہے کہ ہم اسی لفظ کو استعمال کریں اور کہیں کہ ہماری نظر میں خشونت کو ہونا چاہیئے؛ البتہ ہماری مراد خشونت سے پھانسی، قتل، قصاص و تازیانہ مارنے کا حکم ہے۔ہم کو اس بات پر کوئی ضد نہیں ہے کہ ہم لفظ خشونت کو درمیان میں لائیں؛ لیکن چونکہ انسانی حقوق کے بیانیہ اور منشور میں ایسا آیا ہے اور ہم یہ چاہتے ہیں کہ

حقوق انسانی کے بیانیہ کی رد کریں اور اس کو غلط ثابت کریں اور اس کے مقابل کھڑے ہو جائیں؛ اس لئے مجبوراً ہم لفظ خشونت کو استعمال کرتے ہیں اور ہم کہتے ہیں کہ یہ باتیں جو آپ کی نگاہ میں خشونت آمیز ہیں ان کا ہونا ضروری ہے؛ اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ واضح طور سے قران میں بیان ہوا ہے اور اس پر قرآن کی نص اور دلیل موجود ہے اور ہم، العیاذ باللہ، قرآن کا انکار کریں یا عالمی انسانی حقوق کے بیانیہ کا، اور ایک مسلمان واقعاً کبھی بھی انسانی حقوق کے بیانیہ کی خاطر قرآن کی مذمت نہیں کرسکتا اور قرآن کو چھوڑ نہیں سکتا ہے۔

قرآن کریم میں اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے: "الزانیۃ والزانی..." (۱) ہر زنا کرنے والا چاہے مرد ہو یا عورت اس کو سو کوڑے لگاؤ اور اگر تم لوگ خدا اور قیامت پر ایمان رکھتے ہو تو اس خدا کے کام میں ان دونوں کی نسبت کوئی رحم اور دل سوزی نہ کرو۔ اس آیہ کے واضح اعلان کے بعد اگر کوئی خدا اور قیامت پر حقیقی ایمان رکھتا ہے تو اس کو ان دونوں زنا کرنے والوں کی نسبت جنھوں نے زنا جیسے برے فعل کو انجام دیا ہے تھوڑا سا بھی رحم نہیں ہونا چاہئے؛ یہ بات بالکل واضح ہے کہ جب رحم نہیں

....

(۱) سورہ نور: آیہ ۲۔

ہوگا تو بے رحمی پائی جائے گی۔ قرآن میں ارشاد ہو رہا ہے مومن وہ ہے جو ایسی جگہوں پر رحم نہ کرتا ہو؛ البتہ ایسی بے رحمی نہیں جو کہ ظالمانہ بے رحمی کہی جائے۔ بہر حال مسلمان یا قران کی اس آیت کو قبول کرتے ہوئے اس پر عمل کرے یا عالمی انسانی حقوق کے بیانیہ کے

پیچھے جائے اوراس کی حمایت کرے

قرآن مجید میں پھر خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے" والسّارق والسّارقۃ فاقطعوا ایدیھما جزائً بما کسبا" (۱) مرداور عورت نے جو چوری کی ہے اس کی سزا میں ان دونوں کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں۔اور عالمی انسانی حقوق کا بیانیہ کہتا ہے کہ یہ حکم وحشیانہ اور انسانیت کے خلاف ہے۔ مسلمان کو چاہیئے کہ یہاں قرآن اور عالمی حقوق انسانی کے بیانیہ میں سے کسی ایک کو اختیار کرے۔

اسی طرح قرآن کا یہ نظریہ بھی ہے کہ" ولکم فی القصاص حیوٰۃ یا اولی الالباب" (۲) اے عقلمندو! تمھارے لئے قصاص اور بدلہ لینے میں زندگی ہے؛ قرآن کی نگاہ میں معاشرہ کی سلامتی اور زندگی اس وقت ضمانت پائے گی جب قاتل انسان سزا قتل ہے؛ لیکن عالمی انسانی حقوق کا بیانیہ یہ کہتا ہے کہ قتل کی سزا ایک غیر انسانی کام ہے اور اس کو ختم ہونا چاہیئے۔

....

(۱) سورہ مائدہ: آیہ ۳۸۔

(۲) سورہ بقرہ آیہ ۱۷۹.

یہ ایک سازش ہے اور اس شوروغل اور وسیع تبلیغات کے ذریعہ وہ چاہتے ہیں کہ ایسا کام کریں کہ وہ ہم کو اتنا منفعل اور متاثر کردیں کہ ہمارے مراجع تقلید بھی یہ بات کہنے کی جرائت نہ کر پائیں کہ ہمارے یہاں ایسا قانون پایا جاتا ہے۔لہذٰا اس کے مقابلہ میں ہم کو مضبوطی اور فیصلہ کن انداز میں سختی کے ساتھ اپنے موقف پر ڈٹے رہنا چاہیئے، اور کہنا چاہیئے

کہ ہاں اسلام میں سزا، قتل، ہاتھ کاٹنا، جلانا اور آگ میں ڈالنا ہے اگر آپ ان سب کا نام خشونت رکھتے ہیں تو ہم کہیں گے کہ ہاں اسلام میں خشونت ہے اور ہم کو اس سے کوئی ڈر بھی نہیں ہے کہ ہم کو خشونت طلبی سے متہم کیا جائے، ہم کسی سے تکلّف نہیں کرتے ہیں اور الفاظ سے کھیلنا نہیں چاہتے ہیں؛ اگر ہم قرآن کے ماننے والے ہیں تو قرآن نے ان چیزوں کو جس کو عالمی انسانی حقوق کا بیانیہ خشونت جانتا ہے، جائز قرار دیا ہے بلکہ قرآن نے ان سب کو لازم اور واجب جانا ہے، قرآن مجید میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا حکم ہوتا ہے:

"ولیجدوا فیکم غلظة"(۱)

اور وہ کافر تمھارے اندر خشونت کو پائیں [قران نے یہ نہیں کہا" ولیجد وا فی عملکم" بلکہ اس نے "فیکم" کہا ہے یعنی خشونت کو تمھارے اندر لمس کریں اور تمھارا برتاؤ ان کے ساتھ ایسا ہو کہ وہ سمجھیں اور کہیں کہ یہ ایسے افراد ہیں جو احساسات اور جذبات سے متاثر نہ ہوں گے اور اگر ہم کوئی کام بھی خلاف کریں گے تو وہ رحم نہیں کریں گے ہم اگر قرآن

....

(۱) سورہ توبہ: آیہ ۱۲۳۔

کو قبول کرتے ہیں اور مسلمان ہیں تو ہم کو چاہئے کہ ہم کہیں یہ چیزیں قرآن اور اسلام میں ہیں اور اس سلسلہ میں کسی سے ڈرنا نہیں چاہئے:

"الذین یبلّغون رسالات اللہ و یخشونه ولا یخشون احداً الّا اللہ"(۱)

جو لوگ اللہ کے پیغام کو پہونچاتے ہیں وہ کسی سے بھی نہیں ڈرتے ہیں صرف خدا سے ڈرتے

ہیں۔لہذا ہم اگر خدا سے ڈرتے ہیں تو قرآن اور خدا کے حکم کو بیان کریں؛ کم از کم ایسا نہیں ہونا چاہیئے کہ ان کی باتوں کی تائید کریں اور ان کی باتوں کی موافقت اور تائید میں مقالہ لکھیں اور یہاں وہاں تقریر کرتے پھریں۔البتہ ہر انسان اس میدان میں داخل ہونے اور ایسی شجاعت و ہمت دکھانے کی طاقت و ہمّت نہیں رکھتا ہے؛ صرف وہ لوگ اس میدان میں قدم رکھ سکتے ہیں جو دوست و دشمن کی ملامت اور سرزنش کا کوئی ڈر نہ رکھتے ہوں۔قرآن کریم میں خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے

:یجاھدون فی سبیل اللہ ولا یخافون لومۃ لائم "(۲)

وہ لوگ اللہ کے راستے میں جہاد کرتے ہیں اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتے۔

اگر ہم کہیں اسلام قاطعیت رکھتا ہے، یہ عالمی انسانی حقوق کے اعلامیہ کا جواب نہیں ہے انسانی حقوق کا بیانیہ کہتا ہے کہ اسلامی سزائیں خشن اور سخت ہیں اور اس کو ختم ہونا چاہیئے؛ ہم کو بھی یہ کہنا چاہیئے کہ یہ سخت سزائیں اسلام میں ہیں اور ان کو

....

(۱) سورہ احزاب: آیہ ۳۹۔

(۲) سورہ مائدہ: آیہ ٥٤۔

ختم ہونا چاہیئے۔ہم کو نہیں چاہیئے کہ دوسروں کی خوشی اور چاپلوسی کے لئے بعض قرآنی اور اسلامی احکام وقوانین کو قبول کریں اور بعض کا انکار کریں۔بعض کا انکار اور بعض کا اقرار بھی

حقیقی کفر ہے، اسی کی حکایت خداوند عالم قرآن مجید کر رہا ہے: " انّ الّذ ین ۔۔۔ ویقولون نؤمن ببعض ونکفر ببعض اولٰئک ھم الکافرون حقاً " (۱) یعنی جو لوگ .....اور کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لائیں گے اور بعض کا انکار کریں گے .....تو حقیقت میں یہی لوگ کافر ہیں ۔مسلمان اگر واقعاً مسلمان ہے اور قرآن پر اعتقاد رکھتا ہے تو وہ عالمی حقوق انسانی کی خاطر قرآن کریم کے واضح حکم سے چشم پوشی کرے اور اپنے دین کو انسانی عالمی حقوق کے بیانیہ کے بدلے میں بیچ ڈالے یہ ہر گز نہیں ہو سکتا ہے۔

اگر یہ ہو کہ جو کام لوگوں کو اچھا نہ لگتا ہو وہ انجام نہ دیا جائے تو رسول اکرم لات وعزّی کو برا نہ کہتے اور مکہ کے بتوں کو نہ توڑتے ؛ قرآن مجید کا دستور یہ ہے کہ تم کھلے عام خدا اور اس کے دین کے دشمنوں سے بیزاری کا اعلان کرو اور زبان وکلام سے بھی دافعہ رکھتے رہو۔اس ضمن میں قرآن کریم حکم دیتا ہے تم عمل میں حضرت ابراہیم کی ذات کو نمونہ عمل قرار دو: " وقد کانت لکم اسوۃ حسنۃ فی ابراہیم والذین معہ (۲) یقیناً تمھارے لئے ابراہیم کی ذات اور ان کے ساتھیوں

....

(۱) سورہ نساء: آیہ ۱۵۰و۱۵۱۔

(۱) سورہ ممتحنۃ: آیہ ٤۔

میں بہترین نمونہ عمل ہے حضرت ابراہیم اور ان کے ماننے والوں کا عمل اور فعل کیا تھا کہ وہ ہم لوگوں کے لئے نمونہ عمل ہے؟ اس کا جواب اسی کے بعد فوراً خود قرآن مجید نے ذکر کیا ہے:

"اذ قالوا لقومھم انّا برآوا منکم و ممّا تعبدون من دون اللہ و کفرنابکم "(۱)

جب انھوں نے اپنی قوم والوں سے کہا کہ ہم تم سے اور تمھارے معبودوں سے بیزار ہیں اورہم نے تمھاراانکارکردیاہےقرآن مجید حکم دیتاہے کہ ابراہیم کی پیروی کرو؛ جب وہ لوگوں کے مقابل بہت ہی واضح انداز سے کھڑے رہےاورکہا کہ میں تم لوگوں سے بیزار ہوں اور تمھارے خداؤں سے بھی بیزار ہوں؛ یہ قرآن کا دستوراوراس کا حکم ہے، نہ یہ کہ ہم کو لچکدار رویہ اختیار کرنا چاہئے اور یہ کہیں کہ ہم کولوگوں کی سنت اورروش کا احترام کرنا چاہئے اوران کے بتوں کے سامنے جا کر احترام کرنا چاہئے چونکہ ان کے نزدیک بت قابل احترام ہیں !!!قرآن اس کی اجازت کسی کونہیں دیتاہے۔مسلمانوں کو چاہئے کہ واضح انداز سے کہے بت کچھ بھی نہیں؛اسی آیہ میں اس نے آگے بڑھ کرکہا صرف اسی پرخاموش نہیں رہنا چاہئے؛ بلکہ اس سے بھی زیادہ سختی اورتلخی کے ساتھ یہ کہو:

وبدا بیننا وبینکم العداوۃ والبغضاء ابداً حتیّٰ تومنوا باللہ وحدہ(۲)

اورہمارے تمھارے درمیان ہمیشہ کی عداوت اور

....

(۱)اور(۲)سورہ ممتحنہ: آیہ ٤ ۔

دشمنی ہوگئی ہے جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہیں لاتے ہم کو یہ کہنا چاہئے کہ جب تک تمھارا ایساعمل اورایسی فکر رہے گی؛ ہم تمھارے دشمن ہیں اور یہ دشمنی کبھی ختم نہیں ہوگی؛ ہم کو یہ کہنا

چاہیۓ :تم پرلعنت اورتمھارے بتوں پرلعنت ہو؛اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوۓ خدا وندعالم قرآن مجید میں ارشادفرمارہاہے:

اف لکم ولما تعبدون

تم پراور جوکچھ تم پوجتے ہوان سب پرتف اوروائے ہو؛یہ نظریات اورباتیں ایک سرپرعمامہ رکھنے والے یزدی بندہ کی نہیں ہیں، بلکہ یہ قرآن کا واضح حکم ہے کہ ان دشمنوں سے کہہ دوہم تمھارے ہمیشہ دشمن رہیں گے اورتم سے کینہ ودشمنی ہمیشہ رکھیں گے،مگریہ کہ تم لوگ خدا کی طرف آؤ؛مسئلہ اس وقت اوردلچسپ نظرآتاہے، جب ہم آیہ کے بعد کے حصّہ کودیکھتے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ فرماتاہےتم کوابرہیم کااتباع کرنا چاہیۓ اوران کےعمل کونمونہ عمل قراردینا چاہیۓ یہاں پرایک چیزکواس سے جداکیاگیاہے کہ ابراہیم کےاس کام کوتم نہ کرو:

"الّاقول ابراھیم لابیھا لاستغفرنّ لك"

،صرف ابراہیم کا یہ کہنااپنے چچاسے کہ میں تمھارے لئے خداسےضرورآمرزش طلب کروں گا ،ابراہیم جوکہ دشمن کےمقابلہ میں پوری قاطعیت کےساتھ تھےلیکن اپنے چچا

....

(١)سورہ انبیاء: آیہ ٦٧۔

آزرسے متعلق تھوڑارحم ومروت سے پیش آئے اورانھوں نے کہا کہ میں خداسے چاہوں گا کہ وہ تم کوبخش دے؛قرآن میں خداوندعالم فرماتاہےابراہیم کےاس کام کو اختیارنہ کرواورکسی بھی مشرک سے یہ وعدہ نہ کروکہ میں تمھارے لئےخداوندعالم سےمغفرت

طلب کروں گا اور یہ چاہوں گا کہ وہ تم کو بخش دے؛ اگر ہم قرآن کو قبول کرتے ہیں تو بسم اللہ؛ یہ قرآن کا دستور اور تعلیم ہے جو وہ اپنے ماننے والوں کو دیتا ہے۔ اس آیت کا معنی اور مفہوم بھی بالکل واضح اور روشن ہے اس میں کوئی دوسری قرائت بھی نہیں پائی جاتی ہے؛ بس دوسری قرائت یہ ہے کہ ہم قرآن میں تحریف کریں یا اس کے معانی کو پامال کردیں اور دنیا کی خوشی اور عالمی اداروں کی خوشنودی کے لئے اس کے مطالب کو قبول نہ کریں؛ ہم کو اپنی ذمہ داریوں کو واضح کرنا چاہیے یا ہم قرآن کے ماننے والے ہیں؛ یا یہ کہ عالمی انسانی حقوق کے اعلامیہ کے پیرو ہیں؟ ہم کو چاہیۓ کہ جو کچھ قرآن میں ہے اس کو قبول کریں نہ یہ کہ فقط ان موارد کو قبول کریں جو حقوق انسانی کے بیانیہ سے میل کھاتے ہوں؛ اور چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم اور زنا کرنیوالے کو تازیانہ مارنے کا حکم یا پھر قاتل کو قتل کرنے کا حکم یہ سب قرآن میں آیا ہے؛ لہٰذا حقوق انسانی کے بیانیہ کے بعد بھی ہمیں ان سب کو قبول کرنا ہوگا۔ اگر آیہ شریفہ

"ادع الیٰ سبیل ربّك بالحکمة و الموعظة الحسنة"(۱)

....

(۱) سورہ نحل: آیہ ۱۲۵۔

آیہ: "و قاتلوھم حتیٰ لا تکون فتنة"(۱)

اوران سے اس وقت تک جنگ کرو جب تک کہ فتنہ ختم نہ ہو جائے، قرآن آیا ہے اور ہم کو چاہیۓ کہ ہم ان دونوں پر عمل کریں؛ اگر کوئی انسان خدا کو "ارحم الرّاحمین" کے طور پہچانتا ہے تو اس کو چاہیۓ کہ "شدید العقاب" کے عنوان سے بھی اس کو جانے، یہ نہیں ہوسکتا کہ جہاں

قرآن میں خدا کہے کہ میں ارحم الراحمین یعنی سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہوں وہاں تو انسان بہت خوشی سے اس کو قبول کرے لیکن جہاں وہ اپنے کو" شدید العقاب" کہے یعنی بہت سخت عذاب دینے والا ہوں تو وہاں پر کہے کہ یہ تو خشونت ہے اور ہم اس کو قبول نہیں کرتے ہیں۔خداوند عالم ارحم الراحمین فی موضع العفو والرّحمۃ بھی ہے اور اشدّ المعاقبین فی موضع النکال والنقمہ (۲) بھی ہے یہ ہماری کمزوری ہے

....

(۱) سورہ انفال: آیہ ۳۹۔

(۲) ارحم الراحمین کا لفظ سورہ اعراف: آیہ ۱۵۱، اور اشدّ المعاقبین کا لفظ سورہ مائدہ: آیہ ۲ میں آیا ہے اس کے علاوہ روایات اور ادعیہ میں بھی یہ دونوں لفظ استعمال ہوئے ہیں ملاحظہ ہو مفاتیح الجنان (دعائے افتتاح) مولفہ مرحوم شیخ عبّاس قمّی۔

کہ ہم نے اسلام کے حقائق کو ظاہر نہیں کیا ہے اور نص قرآن کے اعتبار سے اسلام کے حقائق بیان کرنے کی شجاعت ہمارے اندر نہیں ہے؛ ہم ان حقائق کو بیان کرنے سے کیوں ڈرتے ہیں؟ مرحوم امام خمینی جس وقت فرماتے تھے تم ان لوگوں کی اس بات سے نہ ڈرو کہ یہ تم کو خشونت اور سنگدلی سے متہم کریں تو آپ کا اشارہ ایسی ہی باتوں کی طرف تھا۔جس اسلام کی طرف ہم لوگوں کو دعوت دیتے ہیں وہ ایک مجموعہ کا نام ہے جس کے اندر یہ سزائیں بھی ہیں جن کا، عالمی حقوق انسانی کا بیانیہ انکار کرتا ہے اور ہمارے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم لوگوں

کوقرآن مجید کی طرف اس کی دس آیہ یا سوآیہ یا تمام آیتوں سے ایک ہی آیت چھوڑ کر دعوت دیں۔

دوسرا سوال اور اس کا جواب

سوال: ہم اس بات کو جانتے ہیں کہ قرآن اور دین اسلام یکبارگی نازل نہیں ہوا ہے بلکہ دھیرے دھیرے معاشرہ اور ماحول کی مناسبت سے اور لوگوں کے فہم ورشد کے اعتبار سے جو پیغمبر کے مخاطب تھے، لایا گیا ہے؛ اسی طرح اس بات کے پیش نظر کہ ہم ایک اسلامی ملک میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور نوّے فیصدی سے زیادہ یہاں کے لوگ مسلمان ہیں، لہٰذ اہمارے لئے لازم ہے کہ ہم اسلام کے تمام مطالب کو بغیر کمی اور زیادتی کے قبول کریں اور بعض کا اقرار یا بعض کا انکار نہ کریں؛ اس میں کوئی بھی بحث نہیں ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ آج ہم نے انقلاب برپا کیا ہے اور ہمارے انقلاب کے اثر کی وجہ سے اسلام کو، جس کی حقیقت دھیرے دھیرے مٹتی جارہی تھی، دوسری حیاتم مل گئی ہے، اس وقت ہم یہ چاہتے ہیں کہ اسلام کو دنیا والوں کے سامنے پیش کریں، اس کو پہچنوائیں اور لوگوں کو اس کی طرف دعوت دیں۔ دوسری طرف ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ مغربی اور سامراجی ذرائع ابلاغ اس بات میں مصروف ہیں کہ وہ اسلام کو ایک خشن اور سنگدل دین کے طور پر پیش کریں اور مسلمانوں خاص کر ایرانی مسلمانوں کو دہشت گرد، بے منطق اور خشونت طلب کے عنوان سے پیش کریں ؛اب اگر ان حالات میں ہم یہ چاہیں کہ چور کے ہاتھ کاٹنے یا زنا کار کو سنگسار کرنے جیسے

احکام کو جاری کریں تو لازمی طور پر دنیا کے لوگوں کے ذہن میں اس کا منفی اثر ہوگا اور مغربی رسالے اور جرائد ان کی تصویر کشی کر کیا سلام اور مسلمانوں کے چہروں کو بہت ہی بری اور نفرت انگیز انداز سے دنیا والوں کے سامنے پیش کریں گے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ اگر دنیا کے سامنے اسلام اس طرح پیش ہوا تو ہم اسلام اور قرآن کے پیغام کو دنیا والوں تک نہیں پہونچا پائیں گے اور کوئی شخص اسلام کی طرف مائل نہ ہوگا سوال یہ ہے کہ کیا ہم مذکورہ مسائل کے سبب ایک بڑی اور اہم مصلحت (یعنی اسلام کی ترویج اور تبلیغ) کی خاطر بعض اسلامی احکام میں تغیر وتبدل انجام دے سکتے ہیں؟ جیسے قتل کے بارے میں اسلام کا پہلا حکم یہ ہے کہ سو اونٹ دیت میں دیئے جائیں؛ لیکن آج ہم نے اس کے برابر دوسری چیز کو بنا لیا ہے اور وہ ستر لاکھ نقد روپیہ دیا جانا ہے اسی طرح کیا ہمارے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم چند جگھوں پر اس کے برابر کوئی دوسری چیز معین کر کے اسلام کی جو کریہہ صورت پیش کی جاتی ہے اس کو دور کر دیں اور لوگوں کو اسلام کے دائرہ میں داخل کریں۔

جواب: البتہ اس کا جواب دینے کے لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر جملہ پر بحث کی جائے؛ لیکن پھر بھی جس قدر یہاں ممکن ہوگا وہ مطلب بیان کروں گا۔

یہ بات جو سوال میں بیان کی گئی کہ ہم اس وقت اسلامی ملک میں اسلام کو بیان کر رہے ہیں

اورتقریباً نوّے فیصدی سے زیادہ وہ لوگ ہیں جو اسلام کو قبول کرتے ہیں اور یہاں پر کسی انحراف اور پریشان ہونے کی گنجائش نہیں ہے، اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ افسوس کے ساتھ ایسی بات نہیں ہے بلکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔آج جبکہ ابھی انقلاب کو زیادہ وقت نہیں گذرا ہے اور ہرروز ریڈیو اور ٹیلیویژن سے امام خمینیکی تقریریں نشر ہوتی ہیں؛ لیکن پھر بھی ہم اپنی آنکھوں سے اس بات کو دیکھتے ہیں کہ بعض تقریروں اور مضامین میں امام خمینیکی باتوں کوکم یا زیادہ کردجاتا ہے آپ خود اسی ملک میں ایک اخبار کو دیکھتے ہیں کہ اس کا سرپرست ایک عالم دین ہے لیکن پھر بھی اسلام اور قرآن کے واضح احکام کے خلاف مطلب اس میں چھپتا ہے، خلاصہ یہ کہ مختلف بہانوں سے اس بات کی کوشش ہورہی ہے کہ جوانوں پر اثر انداز ہوا جائے اور ان کے دل میں شک وشبہ پیدا کیا جائے لہٰذا ہم کوخود اپنے ملک میں اسلام کو پہچنوانے کے سلسلے میں بہت تشویش ہے۔

اور جو یہ کہا گیا کہ ابھی مغربی لوگوں نے اسلام کے متعلق کچھ نہیں سنا ہے اور وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ انھیں اسلام کو پہچنوائیں، تو اس کے جواب میں بھی ہم کہیں گے کہ یہ بات بھی صحیح نہیں ہے۔آج دنیا کی بولی جانے والی تمام اہم زبانوں میں قرآن کا ترجمہ ہو چکا ہے اور دنیا کے لوگ اس وسعت کے ساتھ جو کہ تمام اخبارات ،ریڈیو، ٹیلی ویژن،سٹلائیٹ اور، انٹرنیٹ وغیرہ رکھتے ہیں، حقیقت میں تمام چیزیں ان کے ہاتھوں میں ہیں اور ہمارے لئے یہ کہنا ممکن نہیں ہے کہ ہم کہیں وہ لوگ اسلام سے ناواقف ہیں؛ خاص طور سے وہ وسیع تبلیغ جو آج کے اخبار اور رسالے خصوصاً دنیا کے

صہیونی اور یہودی لوگ اسلام کے خلاف کررہے ہیں؛ آج آپ دنیا کے کسی حصّہ میں چلے جائیں اسلام کو اس عنوان سے پیش کرتے ہیں کہ اسلام نے عورتوں کے حق کا خیال نہیں کیا ہے اور اسلام مردوں اور عورتوں کے درمیان فرق کا قائل ہے؛ میں خود دنیا کے بہت سے ملکوں میں گیا ہوں اور جنوب مغرب میں ایک ملک چیلی ہے وہاں بھی گیا ہوں اور یہی بحث جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے پیش ہوئی تھی اور میں نے خود اس کے بارے میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر انٹرویو دیا تھا۔ خلاصہ یہ کہ اگر ہم یہ کہیں کہ آج دنیا میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو کہ اسلام کے بارے میں کچھ نہیں جانتے اور ہم نئے سرے سے ان کے سامنے اسلام کو پیش کریں تو یہ کہنا صحیح نہیں ہے؛ لیکن پھر بھی اگر ایسے لوگ پائے جاتے ہوں تو ایسا نہیں ہے کہ ہم سب سے پہلے ان سے یہ کہیں کہ اسلام کہتا ہے کہ چور کے ہاتھ کاٹے جائیں یا یہ کہ زنا کرنے والے کو تازیانہ مارا جائے یا کبھی اس کو سنگسار کرنے کا حکم دیتا ہے اور اس جیسے مسائل کو اس کے سامنے بیان کریں، بلکہ یہ فطری بات ہے کہ سب سے پہلے اسلام کے مبانی اور اصول جیسے توحید، نبوت اور قیامت وغیرہ کو پیش کریں جب دھیرے دھیرے ان کا ایمان محکم ہو جائے تو ایک کے بعد ایک اس کے سامنے دوسرے مسائل کی وضاحت کریں۔ یہاں تک کہ شروع میں ہم اسی بات پر اکتفا کریں کہ وہ کلمہ شہادتین کو پڑھ لیں اور مسلمان ہو جائیں یا تمام اسلامی احکام میں ان سے کہیں کہ وہ صرف نماز کی پابندی کرے۔ خلاصہ، شروع میں اس بات کی کوشش کریں کہ اسی قدر ان کو اسلام سے قریب کریں اور پھر دھیرے دھیرے جتنا ان کے لئے عمل کرنا ممکن ہو ان سے کہیں کہ اس پر عمل کرے، البتہ یہ تدریجی تبلیغ

کی سیاست دوسرے ملک اور وہاں کے لوگوں سے متعلق ہوسکتی ہے لیکن تہران، اصفہان اور شیراز کے لوگوں سے مربوط نہیں ہے۔

جو کچھ مختصر طور پر یہاں کہا جا سکتا ہے وہ یہ کہ ہم اس بات سے قطع نظر کہ ایسے حالات اور واقعات پائے جاتے ہوں تو کلی حکم یہ ہے کہ اگر کسی جگہ یا کسی وقت خاص حالات میں ایک حکم کا جاری کرنا اسلام اور اسلامی معاشرہ کے لئے نا قابل تلافی نقصان کا باعث ہو تو یہاں پر ولی امر مسلمین اس بات کا حق رکھتا ہے کہ اپنی ولایت کو استعمال کرتے ہوئے عنوان ثانوی (جو کہ احکام اسلامی میں پایا جاتا ہے) کے مطابق حکم دے، کہ کچھ دنوں کے لئے یہ پہلا حکم اٹھا لیا جارہا ہے۔ البتہ یہ چیز صرف ولی امر مسلمین کے اختیار میں ہے اور کوئی دوسرا اس کام کو انجام نہیں دے سکتا ہے۔ لیکن جس نکتہ کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے وہ یہ کہ یہ حکم جو وقتی طور پر کسی مصلحت کی بنا پر اٹھا لیا جارہا ہے اس میں اور اس بات میں فرق ہے کہ کسی اسلامی حکم کے سرے ہی سے منکر ہو جائیں اور یہ کہا جائے کہ یہ حکم اسلام میں پایا ہی نہیں جاتا یا یہ کہیں کہ یہ حکم آج تک اسلام میں تھا لیکن ہم آج سے اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ اسلام کا حصّہ نہیں ہے۔ ان دونوں میں بہت فرق ہے ایک حکم کا کچھ دنوں کے لئے معطّل ہونا اسلام کے جزائی احکام سے مخصوص نہیں ہے؛ مثلاً ہم خود اس بات کے گواہ ہیں کہ حضرت امام خمینی نے کچھ مصلحتوں کی بنیاد پر حج کو (جو کہ اسلام کی ایک اہم عبادت ہے) تعطیل کیا تھا، کسی حکم کی وقتی تعطیل ایک چیز ہے اور اس حکم سے اصلاً انکار ایک دوسری چیز ہے۔ یہ ممکن ہے کہ کہا جائے یہ حکم کچھ مصلحتوں کی بنا پر فی الحال جاری نہیں ہوگا؛ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ اسلام سنگ

ساری کا حکم ہی نہیں رکھتا اور یہ حکم فقط عرب کے اس زمانہ کے غیر متمدن نیم وحشی انسانوں کے لئے تھا تو ایسی بات اسلام کے ایک حتمی حکم سے انکار اور اس کا نسخ کرنا ہے کہ جس کا کسی کو یہاں تک کہ رسول اکرم کو بھی حق حاصل نہیں ہے۔

یہاں پر ایک تاریخی نمونہ کا ذکر جو کہ مطلب کو واضح اور ثابت کرنے میں مفید ہے مناسب ہوگا۔

اسلام کے ابتدائی ایام میں جب کہ مسلمان بہت ہی تنگی اور سختی میں زندگی بسر کر رہے تھے، طائف کے لوگ آئے اور ان لوگوں نے پیغمبر اسلام سے ایک پیشکش کی اور کہا ہم مسلمان ہونے کو تیار ہیں اور آپ کے ساتھ معاہدہ کرتے ہیں کہ آپ کے ساتھ تعاون کریں گے ،لیکن ایک شرط ہے۔ہم اس بات کے لئے حاضر ہیں کہ شہادتین (کلمہ) پڑھیں؛ بتوں کو نہ پوجیں حتیٰ زکواۃ بھی دیں؛ لیکن ہم کو صرف ایک کام سے معاف کر دیجئے اور وہ سجدہ کرنا ہے۔ ہم اس کام کو جو آپ لوگ کرتے ہیں اور زمین پر جھکتے اور سجدے کرتے ہیں، نہیں کر سکتے ہیں، اگر آپ ہم لوگوں کو سجدہ کرنے سے معاف کر دیجئے تو ہم اس بات کے لئے تیار ہیں کہ بت پرستی کو چھوڑ دیں اور اس کے علاوہ دوسرے برے کام کو بھی ترک کر دیں گے اور آپ کے ساتھ عہد کرتے ہیں کہ جنگوں میں آپ کا ساتھ دیں گے۔

آپ ذرا شرائط کو ملاحظہ کریں؛ مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے اور ان کو طاقت کی ضرورت ہے؛ ان کی مالی قوت کمزور ہے اور انھیں مالی تعاون کی ضرورت ہے اور طائف کے لوگ اکثر امیر اور دولت مند ہیں؛ خلاصہ یہ کہ ایک بھاری تعداد خود اپنی مرضی اور خوشی سے اس بات

کے لئے حاضر ہے کہ ایک قدم نہیں بلکہ سو قدم اسلام سے قریب ہو جائیں گے لیکن صرف ایک بات کہ ظاہری طور پر معمولی سی چیز ہے اس کو قبول نہ کریں گے۔ قرآن اس جگہ فرماتا ہے: "لولا ان ثبتناک لقد کدت ترکن الیھم شیئاً قلیلا" (۱) یعنی اگر ہماری توفیق خاص نے آپ (بشری طور پر) کو ثابت قدم نہ رکھا ہوتا تو آپ کچھ نہ کچھ ان کی طرف مائل ضرور ہو جاتے؛ اگر ان کی طرف جھک جاتے تو کیا ہوتا؟ اس کا جواب بہت ہی سخت لہجہ کے ساتھ اس کے فوراً بعد ہے: "اذاً لا ذقناک ضعف الحیواۃ وضعف الممات ثم لا تجد لک علینا نصیراً" (۲) اور پھر ہم زندگانی دنیا اور موت دونوں مرحلوں پر دہرا مزہ چکھاتے اور آپ ہمارے خلاف کوئی مددگار اور نصرت کرنے والا نہیں پاتے۔ اگر تھوڑا سا بھی جھکاؤ اور تمایل پیدا ہوتا، تو دنیا اور آخرت میں دوسروں کے مقابلے دوگنا عذاب کرتے اور آپ کسی کو اپنی مدد کے لئے نہیں پاتے۔

میں اور آپ تو اپنی جگہ، دین کے انکار کا مسئلہ اور اس کے احکام میں کوتاہی اور سستی ایک ایسی چیز ہے کہ پیغمبر کی طرف سے بھی ممکن نہیں ہے اور اگر بفرض محال ایسی چیز انحضرت کی طرف سے ہو بھی جائے تو خداوند عالم کی طرف سے اس کی باز پرس بہت ہی سخت ہے اور اللہ اس مسئلہ میں کسی سے کوئی تکلف نہیں کرتا۔

....

(۱) سورہ اسرئ: آیہ ۷٤۔

(۲) سورہ اسرئ: آیہ ۷٥۔

اور وہ چیز جو کہ سوال میں دیت کے برابر کوئی دوسری چیز معین کرنے کی تھی اس کے بارے
میں
بھی ہم کہیں گے کہ اس چیز کو ہم نے اپنی جانب سے نہیں بنایا ہے، بلکہ یہ مسئلہ خود روایتوں
میں آیا ہے اور شروع سے ہی روایتوں میں اس کو بیان کیا گیا ہے؛ اس زمانے میں بھی صرف
اونٹ معین نہیں تھا بلکہ اونٹ کے بدلے، سونا چاندی جو کہ اس وقت کے پیسے تھے اور وہ لوگ
اس کو دے سکتے تھے۔

ISLAMICMOBILITY.COM
IN THE AGE OF INFORMATION
IGNORANCE IS A CHOICE

"Wisdom is the lost property of the Believer,

let him claim it wherever he finds it"

Imam Ali (as)